A-PDF Merger DEMO : Purchase from www.A-PDF.com to remove the watermark

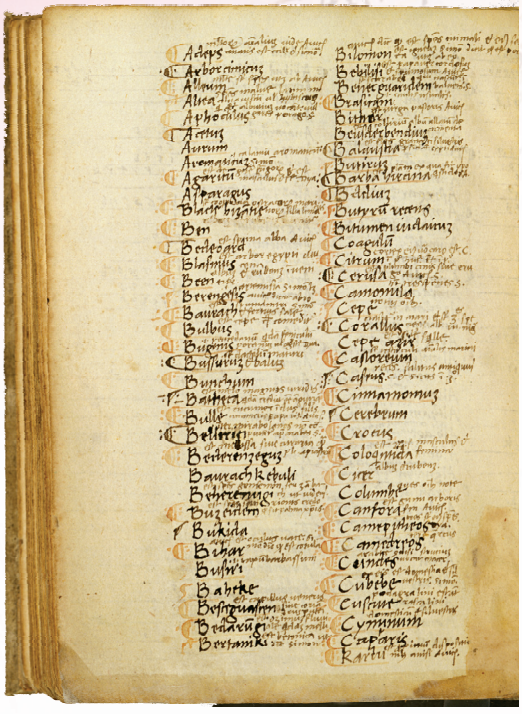

جب یوروپی طبیب کے لیے عربی زبان سے واقفیت لازم خیال کی جاتی تھی۔ علم طب پر ۱۵ ویں صدی کی ایک لاطینی تصنیف جو مروجہ عربی اصطلاحوں کی تشریح سے متعلق ہے۔

رہی یہ بات کہ اس کی شہادت اعداد وشمار سے نہیں ہوتی تھی سو بطلیموس نے یہ نظریہ ایجاد کیا کہ اس مدار کا مرکز زمین سے باہر اور اس طرح یہ کہہ لیجئے کہ کائنات سے باہر واقع ہے۔ مسلم ماہرین فلکیات نے نہ صرف یہ کہ اس خیال کی لغویت واضح کی بلکہ طوسی نے اپنی کتاب تذکرہ میں بطلیموس کے علی الرغم ایک نیا کلیہ پیش کیا جسے **الصغیرۃ والکبیرۃ** یا Tus-couple کا نام دیا جاتا ہے۔ آگے چل کر اس کلیہ کو ابن شاطر نے چاند کی گردش کے سلسلے میں استعمال کیا۔ ابن شاطر اس نتیجہ پر پہنچے کہ تمام سیاروں کی گردش ایک نکتۂ واحد کے گرد ہے۔ ایک بار جب بطلیموس کونی نظام کا اعتبار جاتا رہا اور یہ بات واضح ہوگئی کہ تمام سیارے اپنے مدار میں ایک واحد مرکز کے گرد گھوم رہے ہیں تو کوپرنکس کے لیے یہ ممکن ہوسکا کہ وہ زمین کے بجائے سورج کو محور قرار دے کر ایک نئی کونیات کا اعلان کردے۔ اپنی اس تحقیق واکتشاف میں کوپرنکس کو صدیوں کی مسلم تحقیق و تجزیہ سے بڑی مدد ملی، حتیٰ کہ اس نئی کونیات کی تشریح کے لیے اس نے Tusi-couple اور اس سے متعلق ڈائی گرام کو من وعن اخذ کرنے میں کسی تکلف کا مظاہرہ نہ کیا۔

۱۴۲۔ Marshall Hodgson, *Rethinkg World Histor*y, Cambridge Univeristy Press, 1993, p.97

۱۴۳۔ سقوط قسطنطنیہ نے عالم عیسائیت کو کس قدر لرزہ براندام کردیا تھا اس کا اندازہ اس عہد کے ایک عیسائی مفکر Aeneas Silvius Piccolomini، جو آگے چل کر Pope Pius II کے لقب سے مشہور ہوئے، کے اس خط سے ہوتا ہے جو انھوں نے پوپ نکولس پنجم کی خدمت میں ارسال کیا تھا:

But what is that terrible news recently reported about Constantinople?... Who can doubt that the Turks will vent their wrath upon the churches of God? I grieve that the world's most famous temple, Hagia Sophia, will be destroyed or defiled. I grieve that countless basilicas of the saints, marvels of

architecture, will fall in ruins or be subjected to the difilements of Mohammed. What can I say about the books without number there which are not yet known in Italy? Alas, how many names of great men will now perish? This will be a second death to Homer and a second destruction of Plato.

محولہ: Jerry Brotton, *The Renaissance Bazar, Oxford: New york, 2002*, p.49

۱۴۴۔ Lorenzo Valla نے متنی اور لغوی تحلیل و تجزیہ کی روشنی میں Donation of Constantine کے مشہور زمانہ وثیقہ پر شبہات وارد کر دیے تھے، لیکن تب اس اعتراض کی حیثیت ایک علمی مناقشہ سے زیادہ نہ تھی۔ البتہ لوتھر کی بغاوت کے بعد چرچ کے اقتدار اعلیٰ پر کھلے عام اعتراض وارد کئے جانے لگے اور اس خیال کی صداقت مشکوک ہوگئی کہ قسطنطین نے چرچ کو اپنے تمام تر اختیارات بخش دیے تھے۔ ۱۵۲۰ء میں ابھی سینٹ پیٹر کے چرچ میں ریفیل کے ہاتھوں Donation of Constantine کی ترسیم کا آغاز ہی ہوا تھا کہ لوتھر غضبناک ہو اٹھے، انھوں نے لکھا:

I have at hand Lorenzo Valla's proof that the Donation of Constantine is a forgery. Good heavens, wickedness is at Rome. You wonder at the judgment of God that such what darkness and unauthentic, crass, impudent lies not only lived, but prevailed for so many centuries.

۱۴۵۔ Giorgio Vasari کی مشہور زمانہ تالیف *Lives of the Artist* مطبوعہ ۱۵۵۰ء جسے Renaissance Art کے بائبل کے طور پر دیکھا جا تا رہا ہے، نے نشاۃ ثانیہ کے استعارے کو مقبول عام بنانے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ اس کتاب کی اشاعت سے ہوا یہ کہ فنکار اور مصور جو اب تک علماء اور پادریوں کے مقابلے میں سماجی توقیر کے حامل نہ تھے، اب انھیں بھی احترام کا سزاوار سمجھا جانے لگا، البتہ اس کتاب پر ایک نظر ڈالنے سے یہ حقیقت منکشف ہوئے بغیر نہیں رہتی کہ یہ فنکار نشاۃ ثانیہ کے اس رومانوی اسطورے کی نمائندگی نہیں کرتے جسے انفس و آفاق کے مشاہدے، حریت فکری اور ایک فجر جدید کا نقیب باور کرایا جاتا ہے۔ حقیقت بس اتنی ہے کہ یہ حضرات آرٹ کے ذریعہ کیتھولک چرچ کی تنگ نظری کی تبلیغ و تشریح میں مصروف تھے۔ مخالفین خواہ وہ مسلمان ہوں یا پروٹسٹنٹ عیسائی ان کے لیے ان کے ہاں کوئی جگہ نہ تھی۔

۱۴۶۔ کہا جاتا ہے کہ ایک عیسائی کلینڈر کی تشکیل کا خیال سب سے پہلے آٹھویں صدی کے آخر میں شارلیمان کی ایما پر Venerable Bede کی طرف سے پیش کیا گیا۔ اس سے پہلے کسی خالص عیسائی کلینڈر کا کوئی وجود نہ تھا۔ ملاحظہ کیجئے بیڈ کی مشہور زمانہ تالیف: *Ecclesiastical History of the English Nation*

۱۴۷۔ مروّجہ گریگورین کلینڈر جسے ۱۵۸۲ء میں ترمیم و اصلاح کے بعد جاری کیا گیا۔ پروٹسٹنٹ عیسائیوں کے نزدیک ایک عرصہ تک متنازع رہا۔ کہا جاتا ہے کہ اہلِ یورپ کو اس کلینڈر پر متفق ہونے میں کوئی سو سال سے زیادہ کا عرصہ صرف ہوا۔ ملاحظہ کیجئے:

The Renaissance Bazaar: From the Silk Road to Michelangelo, Oxford University Press, New York, 2002, p.194

جب ابن الہیثم کے بغیر گلیلیو کا اعتبار قائم نہ ہوتا تھا۔
ہیویلیس کی کتاب selenographia مطبوعہ ۱۶۴۷ء کے سرورق پر
گلیلیو کے ساتھ ابن الہیثم کو دکھایا گیا ہے۔

۱۴۸۔ کتاب پیدائش (باب ۹، آیت ۲۷) میں نوح کے تین بیٹوں کے قصے کو نئے اسطورہ کی تعمیر میں کچھ اس طرح لگایا گیا کہ Japheth کو عیسائی یورپ عطا ہوا اور Shem کے حصے میں بے دینوں (Pagans) پر مشتمل ایشیا کا خطہ آیا۔ یورپ اہل یقین عیسائیوں کے مسکن کی حیثیت سے نہ صرف یہ کہ تقدیس کا حامل قرار پایا بلکہ اہل یورپ کو اس فریضۂ منصبی پر بھی مامور سمجھا گیا کہ وہ دین و تہذیب سے ناآشنا ایشیائی اقوام کو اپنے خداشناس دائرۂ اثر میں لانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ رکھیں گے۔ انیسویں صدی میں اقوام یورپ کے استعمارانہ عزائم کو نظری اور اخلاقی جواز بخشنے میں اس اسطورے نے بڑا کام کیا۔

۱۴۹۔ ملاحظہ کیجئے: Georges Duby, *The Three Orders: Feudal Society Imagined* (Chicago: Chicago University Press, 1980)

۱۵۰۔ Gerd Tellenbach, *Church, State and Christian Society at the Time of the Investiture Conflict* (Oxford: Blackwell, 1959), p.39

۱۵۱۔ ملاحظہ کیجئے: Michael Mann, *The Sources of Social Power*, vol.I Cambridge University Press, 1986, p.381.

۱۵۲۔ عرب علوم اور اسلامی تہذیب کے عمومی غلبہ نے مغرب کی مسلسل تقلیب کا سامان کر رکھا تھا۔ ایسا اس لیے کہ علوم کے ساتھ اس کی ثقافت اور دائرۂ فکر بھی در آیا فطری تھا۔ مغرب کے لیے مسلمانوں کے اکتشافی علوم میں ایک رومانوی دلچسپی تھی، البتہ ان کے مذہب کے سلسلے میں ان کے دل ہمیشہ تنگ رہے۔ مثال کے طور پر روجر بیکن کو ہی لیجئے جن کے لیے ابن الہیثم زندگی بھر آخری حوالہ رہا، اسلامی طرز زندگی کو مسترد کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ اسے اس لیے اختیار نہیں کیا جا سکتا کہ اہل عرب کثرت ازدواج کے سبب جنسی لذتوں میں مست رہتے ہیں۔ پٹرارک تو یہاں تک کہتے ہیں کہ میرے لیے یہ یقین کرنا

مشکل ہے کہ کوئی اچھی چیز دنیائے عرب سے بھی آسکتی ہے۔ دانتے کی *Divine Comedy* بھی اس خیال کی توثیق کرتی ہے کہ اہل مغرب کے لیے مسلمانوں کا علم وفلسفہ تو قابل قبول ہے البتہ دین سے انھیں حد درجہ انقباض ہے۔ دانتے کے ہاں رسول اللہؐ اور حضرت علیؓ کا مقام تو (نعوذ باللہ) جہنم ہے، البتہ صلاح الدین، ابن رشد اور ابن سینا اعراف میں نجات کے منتظر ہیں۔ Siger de Babant جن کی شہرت فلسفہ ابن رشد کے سبب ہے، جنت میں دکھائے گئے ہیں۔ دانتے کی یہ تصنیف دراصل یوروپی اقوام کی اجتماعی حسیت کا آئینہ دار ہے، جہاں اسلام اور مسلمانوں سے سات سو سالہ علمی اکتساب کے باوجود اسلام اور پیغمبر اسلام کے بارے میں ان کی معاندت ختم نہیں ہوتی۔ متعلقہ حوالوں کے لیے ملاحظہ کیجیے:

Roger Bacon, *Opus Maj*us, trans, Robert Belle Burke (Philadelphia: University of Pennsylvania Press, 1927), p.815. Francesco Petrarch, *Letters of Old A*ge, trans. Aldo S.Bernard, Saul Levin, and Reta A.Bernard, Johns Hopkins University Press, 1992, 2:472

۱۵۳۔ تفصیلی مباحث کے لیے دیکھیے: Denys Hay, *Europe: the Emergence of an Ide*a, Edinburgh University Press, 1957, p.1.

۱۵۴۔ اسپین سے مسلمانوں کے انخلاء کے لیے لڑی جانے والی جنگوں کے دوران عین فیصلہ کن لمحات میں سینٹ جیمس کی غیبی مدد کے نعرے بلند ہوتے رہے ہیں۔ جس طرح وینیس سینٹ مارک کا شہر سمجھا جاتا ہے اسی طرح سینٹ جیمس کو اسپین کے سرکاری سینٹ کا مرتبہ حاصل ہے جن کی سرپرستی نے، جیسا کہ مقبول عام عیسائی خیال ہے، اہل اسپین کو مسلمانوں کے غلبہ واستیلاء سے نجات دلانے میں کلیدی رول ادا کیا ہے۔ یہ سینٹ جیمس کوئی اور نہیں حضرت مسیح کے بارہ حواریوں میں سے ایک ہیں جو یروشلم میں ۴۴ء میں شاہ ہیروڈ اوّل ایگریپا کے ہاتھوں شہید کردیے گئے تھے۔ تاریخی اعتبار سے تو ان کا مرقد مبارک یروشلم میں واقع ہونا چاہیے، لیکن عوامی خوش عقیدگی نے ان کے مرقد کی دریافت اسپین میں کرلی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ شاہ رامپرو اوّل (King of Castile) کے خواب میں وہ اس وقت ظاہر ہوئے جب اسے عبدالرحمن ثانی کی فوج کا سامنا تھا۔ سینٹ جیمس نے رومیر واوّل کو نصرت وتائید اور فتح کی یقین دہانی کرائی بلکہ ۸۴۴ء میں عین کلاویو (Clavijo) کی میدان جنگ میں انھوں نے عیسائی افواج کی قیادت فرمائی۔ اہل یقین نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ سینٹ جیمس زرہ بکتر پہنے آوارد ہوئے ہیں اور فضا سینٹیا گو، سینٹیا گو (Santiago, Santiago) کے نعروں سے گونج اٹھی۔ کہا جاتا ہے کہ مختلف فیصلہ کن جنگوں کے موقعوں پر اہل یقین نے سینٹ جیمس کو اپنے چشم ظاہر سے وارد ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔ ان کا وجود اہل اسپین کے لیے خدا کی خاص نعمت بتائی گئی اور انھیں خوش عقیدہ عیسائیوں میں Santiago Matamaros یعنی موروں یا مسلمانوں کو تہہ وتیغ کرنے والے سینٹ کی حیثیت سے دیکھا گیا۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجیے:

Rafael Altamira, *A History of Spai*n,New York1949, p.103.

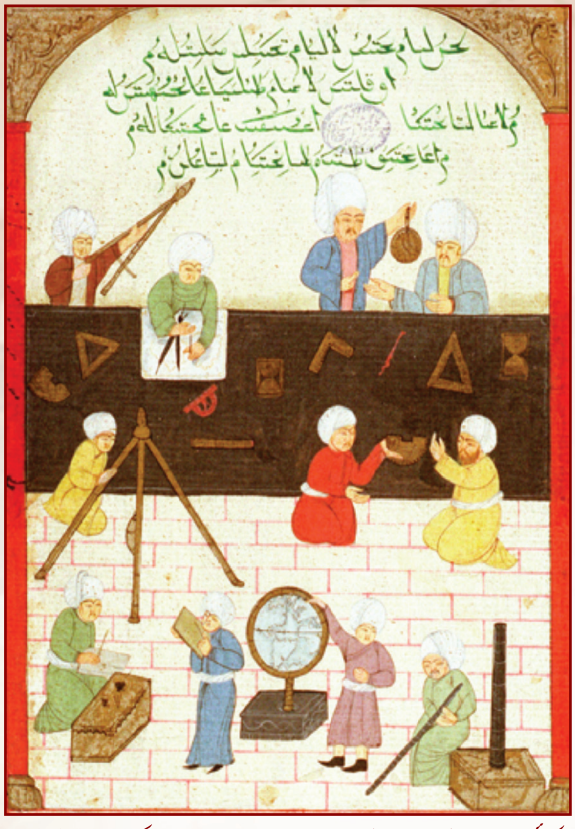

کوئی ہزار سالوں تک جب علومِ عربیہ (Natural Sciences) کی قیادت مسلمانوں کے ہاتھوں میں تھی سائنسی مطالعات کی بین الاقوامی زبان عربی تھی۔

۱۵۵۔ مثال کے طور پر Trevor-Roper نے اپنی کتاب *The Rise of Christian Europe* میں بڑی ڈھٹائی کے ساتھ یورپ کی پانچ سو سالہ سبقت کا ذکر کیا ہے، لکھتے ہیں:

The new rulers of the world, whoever they may be, will inherit a position that has been built up by Europe, and by Europe alone. It is European techniques, European examples, European ideas which have shaken the non-European world out of its past-out of barbarism in Africa, out of a far older, slower, more majestic civilisation in Asia; and the history of the world, for the last five centuries, in so far as it has significance, has been European history. I do not think that we need to make any apology if our study of history is European-centric. (Trevor-Roper 1965:11).

ہمارے خیال میں پانچ سو سالوں کے یوروپی غلبہ کا یہ فسانہ سخت مغالطہ ہے جو دراصل ان مغربی مغنّیوں کا پیدا کردہ ہے جن کی کتابیں *Triumph of the West* by John M. Roberts (1985) اور *The Wealth and Poverty of Nations* by David S. Landes (1998) اس تاثر کو قائم رکھنے میں اہم رول ادا کرتی رہی ہیں۔ پچھلے دس پندرہ سالوں میں اس خیال کے بطلان پر خاصی وقیع کتابیں منظرِ عام پر آئی ہیں جو یہ بتاتی ہیں کہ مغرب کی عالمی بالادستی تازہ تازہ عمل ہے جس کی ابتدا انیسویں صدی کی ابتدا میں ہوئی۔ ملاحظہ کیجئے:

Samir Amin, *Eurocentrism*, London, 1989; Janet L. Abu-Lughod, *Before European Hegemony*, Oxford, 1989; James M. Blaut, *The Colonizer's Model of the World*, London, 1993; Bryan S.Turner, *Orientalism, Postmodernism and Globalism*, London,1993; Jack Goody, *The East in the West*,

Cambridge, 1996; Andre Gunder Frank, *ReOrient*, Berkeley, 1998; Clive Ponting, *World History*, London, 2000. اس سلسلے میں مارشل ہاگسن (Marshall G. S. Hodgson) کی کتاب *The Venture of Islam,* 3Vols. مطبوعہ ۱۹۷۴ء اور ایرک وولف (Eric R. Wolf) کی کتاب *Europe and the People without History* (1982) بھی اہمیت کی حامل ہے، جس سے مستقبل کے متلاشیانِ حق بے نیاز نہیں ہو سکتے۔

بابائے کیمیا جابر بن حیّان

۱۵۶۔ واسکوڈی گاما اور کولمبس کے بحری سفر کو تاریخی سیاق میں دیکھنے سے اس کی واقعی حیثیت کا اندازہ ہوتا ہے۔جس وقت ڈی گاما اپنا پچاسی فٹ لمبا جہاز لے کر نکلا ہے اس وقت اہل چین کے پانچ سو فٹ لمبے اور ایک سو اسی فٹ چوڑے جہاز سمندر پر رواں دواں چلے آتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ چینی جہاز راں چینگ کے جہاز کے مقابلہ میں کولمبس کے جہاز کے مستول کی اونچائی آدھی سے زیادہ نہ تھی۔ کولمبس کا جہاز نینا جس سے جدید دنیا کی ابتدائی مہم جوئی وابستہ کر لی گئی ہے اس میں زیادہ سے زیادہ سوٹن سامان لادنے کی گنجائش تھی جبکہ اسی عہد میں چینگ کے جہاز اکتیس سو (۳۱۰۰) ٹن مال لادنے کی صلاحیت رکھتے تھے، اس پر مشرق کے ان عرب جہاز رانوں کو قیاس کیا جا سکتا ہے جنھیں اس وقت امیر البحر کی حیثیت حاصل تھی۔

محولہ: Jack Goody, *The East in the West* (Cambridge: Cambridge University Press, 1996), p.92.

۱۵۷۔ اس بات کے وافر تاریخی شواہد موجود ہیں کہ واسکوڈی گاما کے بحری سفر ہند میں انھیں ایک گجراتی مسلمان رہنما کی معیت حاصل تھی جسے انھوں نے ساحل افریقہ سے اس سفر میں شرکت پر آمادہ کر لیا تھا۔ بعض مؤرخین نے مشہور عرب جہاز راں احمد بن ماجد کا نام بھی لیا ہے جسے روایت اور درایت دونوں بنیادوں پر قابل اعتبار قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اولاً ڈی گاما جس وقت بحر ہند کے سفر پر چلا ہے اس وقت شہاب الدین احمد بن ماجد فن جہاز رانی میں ایک انتہائی معتبر اور بزرگ معلم کی حیثیت

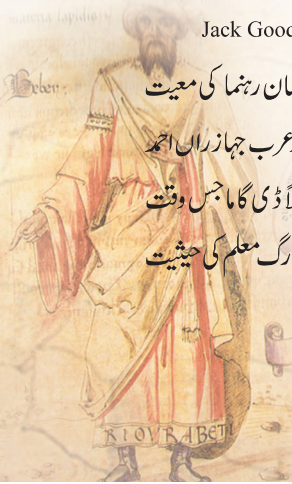

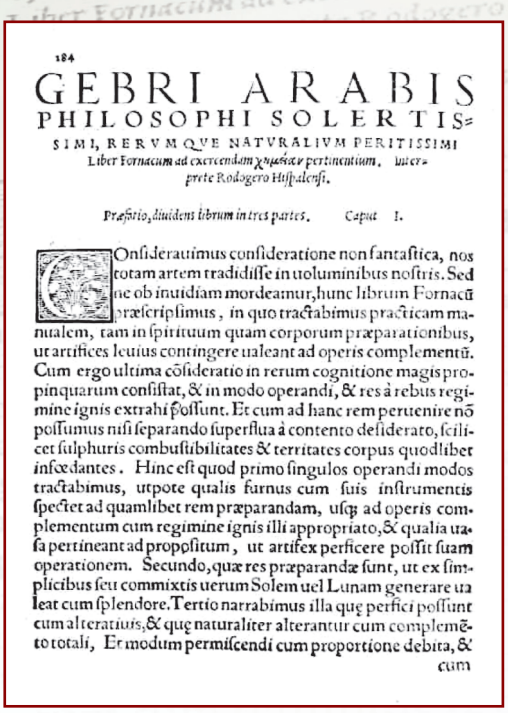

184

GEBRI ARABIS PHILOSOPHI SOLERTISSIMI, RERVMQVE NATVRALIVM PERITISSIMI

Liber Fornacum ad exercendam χημείαν pertinentium, interprete Rodogero Hispalensi.

Præfatio, diuidens librum in tres partes. Capvt I.

COnsideratiuimus consideratione non fantastica, nos totam artem tradidisse in uoluminibus nostris. Sed ne ob inuidiam mordeamur, hunc librum Fornacũ præscripsimus, in quo tractabimus practicam manualem, tam in spirituum quam corporum præparationibus, ut artifices leuius contingere ualeant ad operis complementũ. Cum ergo ultima cõsideratio in rerum cognitione magis propinquarum consistat, & in modo operandi, & res à rebus regimine ignis extrahi possunt. Et cum ad hanc rem peruenire nõ possumus nisi separando superflua à contento desiderato, scilicet sulphuris combustibilitates & territates corpus quodlibet infœdantes. Hinc est quod primo singulos operandi modos tractabimus, utpote qualis furnus cum suis instrumentis spectet ad quamlibet rem præparandam, usq; ad operis complementum cum regimine ignis illi appropriato, & qualia uasa pertineant ad propositum, ut artifex perficere possit suam operationem. Secundo, quæ res præparandæ sunt, ut ex simplicibus seu commixtis uerum Solem uel Lunam generare ualeat cum splendore. Tertio narrabimus illa quę perfici possunt cum alteratiuis, & quę naturaliter alterantur cum complemẽto totali, Et modum permiscendi cum proportione debita, & cum

جابر کے مسلم الاصل ہونے کی ایک دستاویزی شہادت
بولوگنا یونیورسٹی میں محفوظ لاطینی مخطوطہ نمبر (۷۵۶)۴۴۸

سے دیکھے جاتے تھے۔فن جہاز رانی پر ان کی وقیع تالیف کتاب الفوائد فی اصول علم البحر والقواعد اور وسیع بحری تجربات کے سبب انھیں اسد البحر کے لقب سے مخاطب کیا جاتا تھا۔ ایک ایسے بزرگ اور قابلِ تعظیم شخص کے لیے اس بات کی کوئی گنجائش نہ تھی کہ وہ نوآموز پرتگالیوں کو اپنی فنی خدمات فراہم کرتے، خاص طور پر ایک ایسی صورت حال میں جب ان پرتگالیوں کی مسلم دشمنی مسلّم ہو اور جب فنی باریکیوں کا افشا کسی بھی اعتبار سے اسلام اور مسلمانوں کے لیے نامناسب خیال کیا جاتا ہو۔ ابن ماجد ایک راسخ العقیدہ اور خداترس مسلمان تھے، ان کے نزدیک معلم بحر کے لیے یہ بات بنیادی اہمیت کی حامل تھی کہ وہ اپنے فن سے واقفیت کے ساتھ خداترس بھی ہو۔

(وینبغی للمعلم - یقصد ربان السفینۃ أو قائدھا - أن یکون عادلا تقیا لا یظلم احداً مقیما علی طاعۃ اللّٰہ، متقیا اللّٰہ حق اتقائہ تعالی)

کتاب الفوائد جس کی اشاعت کا زمانہ ۱۴۹۰ء کے قریب ہے، بحری سفر کے لیے مخزنِ معلومات کی حیثیت رکھتی ہے جس میں اس بات کی تفصیلات موجود ہیں کہ معلم بحر کو بحری سفر کے دوران کن کن باتوں سے واقفیت ہونی چاہیے اور کن ممکنہ مسائل اور مشکلات پر وہ قابو پاسکتا ہے۔ ساحلی علاقوں کا سفر کھلے سمندر کے سفر سے کتنا مختلف ہوتا ہے اور یہ کہ مشرقی افریقہ سے لے کر انڈونیشیا تک کے سفر میں مختلف موسم میں موسمی ہواؤں، مانسون اور چھوٹے بڑے سمندری طوفانوں سے کب، کہاں اور کس طرح سابقہ پیش آسکتا ہے۔ کتاب الفوائد فرد واحد کا تجربہ نہیں بلکہ اس کتاب میں نسل ہا نسل کے بہترین تجربات کا عرق کشید کرلیا گیا ہے۔ ابن ماجد کو جہاز رانی کا فن ورثہ میں ملا تھا۔ ان کے والد نے اپنے تجربات کے علاوہ اس فن پر مروّجہ کتابیں بھی ترکے میں چھوڑی تھیں۔ اب جو ایک شاعر اور اہل قلم کو یہ سب کچھ میسر آیا اور اس پر بحری سفر کا تجربہ مستزاد تو کتاب الفوائد معرض وجود میں آئی۔ جو شخص بھی اس کتاب کی ورق گردانی کرے گا اسے اس بات پر یقیناً حیرت ہوگی کہ ایک ایسے عہد میں جب بحری سفر کے بارے میں انسائیکلو پیڈیائی تصنیفات موجود تھیں، جب عرب مسلمان تاجروں

کتاب کامل الصناعۃ الطبیۃ اپنے لاطینی قالب کے ساتھ

کے جہاز انڈونیشیا سے لے کر افریقہ کے ساحلوں تک تجارت میں مصروف تھے اور جب یہ سب کچھ مسلمان جہاز رانوں کے لیے ایک معمول کا عمل تھا، اس وقت آخر واسکوڈی گاما کس بحری راستہ کی دریافت کے لیے نکلے تھے۔ یہ دریافت نوآزمودہ پرتگالیوں کے لیے تو یقیناً اہم تھی، لیکن اسے عالمی رزمیہ کے طور پر دیکھنے کا کوئی علمی جواز نہیں ہے۔ ملاحظہ کیجئے:

شہاب الدین احمد بن ماجد، الفوائد فی اصول علم البحر القوائد، مخطوطہ نمبر: ۶۹۲۵۵۸۴۵۱، لائبریری آف کانگریس

۱۵۸۔ J. M. Roberts, *The Triumph of the West*, London, 1985, pp.175-194.

۱۵۹۔ پندرہویں صدی کے نصف آخر میں پوپ کی طرف سے جاری کیے گئے تین فرمان (Papal Bulls) بڑے دوررس اور بھیانک انجام کا باعث ہوئے۔ ۱۴۵۲ء کے فرمان، جسے Dum Diversas کا نام دیا جاتا ہے، کے مطابق پوپ نکولس پنجم کی طرف سے شاہِ پرتگال الفونسو پنجم کو اس بات پر مامور کیا گیا تھا کہ وہ سارا سن (مسلمان) اور دوسرے بے دینوں کی خبر لے اور ان پر ایک طرح کی ابدی غلامی مسلط کر دے۔ اس فرمان نے مغربی افریقہ میں سفید فام افراد کے ذریعہ غلاموں کی تجارت جیسے فعل شنیع کو جواز فراہم کرنے میں اہم رول ادا کیا۔ پوپ نکولس پنجم کے ایک دوسرے فرمان بمطابق ۱۴۵۵ء نے اس بات کا اذنِ عام عطا کر دیا کہ افریقہ اور امریکہ کے علاقوں میں غیر عیسائی اقوام کو غلام بنایا جائے اور ان کے علاقوں

Recueil des traités de médecine

رازی کی کتاب کا لاطینی قالب

(مترجم: گیرارڈ آف کریمونا، تیرہویں صدی)

پر قبضہ کرلیا جائے۔ ۱۴۹۳ء میں پوپ الگزنڈر ششم نے اسپین کو اس بات پر راغب کیا کہ وہ نئی دنیا امریکہ کے مقامی باشندوں کو تہذیب و ایمان کی دولت سے آشنا کرے، ان تین پے بہ پے احکامات نے آنے والے دنوں میں مغربی استعمار کے لیے راہ ہموار کردی۔ پھر انسانوں کے ہاتھوں انسانوں پر وہ مظالم ڈھائے گئے جس کا تصور بھی کوئی مہذب شخص نہیں کرسکتا۔ پندرہویں اور سولہویں صدی میں غلاموں کی خرید وفروخت ایک عالمی تجارت بن گئی۔ ملک کے ملک اپنے اصل باشندوں سے خالی کرا لیے گئے۔ اس بارے میں مزید تفصیل کے لیے دیکھئے: حوالہ نمبرات ۱۹۲ تا ۱۹۶۔ *Dum Diversas* کے متن کے لئے دیکھئے:

European Treaties bearing on the History of the United States and its Dependencies to 1648, Frances Gardiner Davenport, editor, Carnegie Institution of Washington, 1917, Washington, D.C., pp. 20-26.

۱۶۰۔ Charles R. Boxer, *The Portuguese Seaborne Empire,* 1415-1825, London,1969, pp.22-3

۱۶۱۔ مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ کیجئے: Janet L.Abu-Lughod, *Before European Hegemony,* Oxford, 1989, pp.19, 209, 258, 363.

نئی تہذیب کے مؤسس کی حیثیت سے واسکوڈی گاما کی اساطیری تصویر بھی مقبول عام مغربی رزمیہ کی پیدا کردہ ہے ورنہ خود اہل یورپ کی اپنی کتابوں میں اس بات کی وافر شہادت موجود ہے کہ ڈی گاما جب ہندوستان کے سفر پر چلا ہے تو وہ مروّجہ اور مانوس راستوں پر سفر کررہا تھا، جہاں عرب جہاز رانوں کی چلت پھرت عام تھی۔ اور یہ کہ ہندوستان میں جب ۱۴۹۸ء میں وہ پہنچا ہے تو اس وقت اس کا سامنا ایک ایسی تہذیب سے تھا جو پرتگالیوں کے مقابلے میں بدرجہا آگے تھی۔ آخر ہم اس حقیقت کو کیسے نظر انداز کرسکتے ہیں کہ ۱۴۸۷ء میں شاہ پرتگال جان ثانی نے Pedro de covilha کو ہندوستان کے سفر پر بھیجا تھا جس نے واپسی پر اس امر پر حیرت کا اظہار کیا تھا کہ ہندوستانی بندرگاہوں پر اس نے جو کچھ دیکھا اس سے اس کی عقل دنگ رہ گئی۔ عرب تاجروں کے گودام مختلف قسم کے سامانوں سے بھرے تھے۔ محولہ: Joseph Desomogyi, *A Short History of Oriental Trade* (Hildeshei: Georg Olms Verlagsbuchhandlung, 1968), p.83

جب مسلمان و انزلنا الحدید فیھا باس شدید کی اہمیت سے واقف تھے۔
فتح قسطنطنیہ میں اس قبیل کے راکٹ نے دو کلومیٹر تک ۶ ٹن وزنی بارودی اسلحوں اور چٹانوں کی بارش کر دی تھی۔
ترکوں کی عسکری ہیبت کے سبب اسے ترک بمبار کا نام دیا جاتا۔

بلکہ خود ڈی گاما جب ۱۴۹۸ء میں شکر، تیل اور کپڑے کے بنڈلوں کے ساتھ کالی کٹ پہنچا ہے تو یہ سامانِ تجارت دیکھ کر مقامی راجا کو ہنسی آ گئی۔ وہاں موجود عرب تاجروں نے اسے بتایا کہ ان پرتگالیوں کے پاس کوئی ایسی چیز نہیں جس کی ہندوستان میں ضرورت ہو یا جسے دیکھ کر انھیں تاجر سمجھا جائے۔ کیا عجب کہ تاجروں کے بھیس میں یہ بحری قزاق ہوں۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھئے:

Joseph Needham in Mansel Davies, *A Selection from the Writings of Joseph Needham* (Lewes, Sussex: The Book Guild, 1990), p.176

۱۶۲۔ ملاحظہ کیجئے: Fuat Sezgin, *Jabir ibn Hayyan, Texts and Studies.* Vo.I, *(Natural Sciences in Islam*, 69), Frankfurt, 2002.

۱۶۳۔ McLean, Adam, *The Book of the Composition of Alchemy.* Glasgow, 2002, p.3; Ruska, Julius, *Arabische Alchemisten*, Wiesbaden, reprint, 1967, p.48

۱۶۴۔ فرانسس بیکن کے اصل الفاظ یوں ہیں:

The sciences which we possess have been principally derived from the Greeks, for the additions of the Roman, Arabic or more modern writers, are but few and of small importance, and such as they are, are founded on the basis of Greek inventions. *(Novum Organum,* p.332)

۱۶۵۔ جس شخص نے مغرب کو سب سے پہلے مشاہداتی اور تجرباتی منہج سے متعارف کرایا وہ فرانسس بیکن نہیں بلکہ روجر بیکن (۱۲۹۲ء-۱۲۱۴ء) ہے، جس کا زمانہ بیکن سے کوئی ساڑھے تین سو سال پہلے کا ہے۔ اس نے اپنی تین کتابوں *Opus Maius*، *Opus Minus* اور *Opus Tertium* میں اس منہج پر تفصیلی اظہار خیال کیا ہے۔ روجر کا یہ منہج علمی ان عرب کتابوں کے لاطینی ترجموں کی دین تھا جن سے اشتغال میں وہ عمر بھر مصروف رہا۔ *Opus Tertium* میں ان لاطینی کتابوں پر زر کثیر صرف کرنے کا اس نے تذکرہ کیا ہے:

I sought the friendship of all the wise men among the Latins; and I caused young men to be trained in languages, in geometrical figures, in numbers, in the construction of tables, in the use of instruments, and in many other necessary things... During this time I spent more than two thousand pounds in those things, and in the purchase of books and instruments.

اپنے عرب (مسلم) اساتذہ کی طرح روجر علم کے سلسلے میں اس انکسار کا حامل بھی ہے جس کے مطابق آگہی کی منزل طویل ہے اور حقیقت کا اصل علم تو صرف اللہ کے پاس ہے:

It is certain that never, before God is seen face to face, shall a man know anything with final certainty/ It is impossible therefore for a man to attain perfect knowledge in this life, and it is exceedingly difficult for him to attain imperfect truth, and he is very prone and disposed toward whatever is false and empty; wherefore man ought not to boast of his knowledge, nor ought anyone to magnify and extol what he knows. For his knowledge is small and of little value in comparison with what he does not understand, but believes, and still smaller in comparison with that of which he is ignorant and does not know either by faith or knowledge.

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ انسان تحقیق و اکتشاف سے پہلو تہی کرے اور قدماء کا تابع و مہمل بن کر رہ جائے کہ بقول روجر اس سے بڑی کوئی لعنت نہیں کہ انسان پرانے انکشافات سے چمٹا رہے اور نئی راہوں کا متلاشی نہ ہو، سو انسان کو چاہیے کہ وہ ان چار چیزوں سے اپنا دامن بچائے جو تلاش حق میں بالعموم رکاوٹ کا سبب بنتی ہیں۔ اولاً تقلید بزرگاں یعنی استناد کے لیے مشائخ یا اساتذہ کی طرف دیکھنا۔ ثانیاً رسم و رواج کے اثرات، ثالثاً مقبول عام تعصّبات اور رابعاً اپنے جہل اور اپنی کم مائیگی کا اعتراف نہ کرنا، جس کے لیے اکثر لوگ غیر ضروری اظہار علم کا سہارا لیتے ہیں۔ *Opus Majos* میں روجر نے بڑی تفصیل کے

ساتھ حقیقت نفس الامر کی تلاش میں اس منہج کی افادیت کا ذکر کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

Ospedale di Santa Maria della Scala

مسلم تہذیب کے زیر اثر اٹلی میں قائم ہونے والا غالباً یوروپ کا پہلا ہسپتال

For there are two modes of acquiring knowledge, namely, by reasoning and by experience. Reasoning draws a conclusion, and makes us grant the conclusion, but does not make the conclusion certain, nor does it remove doubt so that the mind may rest on the intuition of truth, unless the mind discovers it by the path of experience... Aristotle's statement, then that proof is reasoning that causes us to know is to be understood with the proviso that the proof is accompanied by its appropriate experience, and is not to be understood as the bare proof. Reasoning does not suffice, but experience does... He therefore who wishes to rejoice without doubt in regard to the truth's underlying phenomena must know how to devote himself to experiment.

بیکن کے اس علمی اور استخراجی طرز فکر نے آنے والے دنوں میں مغرب میں ایسے اہل دانش کی ایک نسل پیدا کر دی جو چرچ کے مسلمہ معتقدات کے برعکس علم کو تحلیل و تجزیہ کی میزان پر پرکھنا اور مشاہدے و تجربے سے اسے صیقل کرنا لازم خیال کرتے تھے اور جس کے سبب انھیں چرچ کے عتاب کا نشانہ بننا پڑا۔ خود روجر بیکن سترہ سال تک چرچ کی قیود و بندشوں کا نشانہ بنے اور جب اپنی موت سے کچھ پہلے ۷۷ رسال کی عمر میں انھیں رہائی ملی تو وہ بھی اس لیے کہ انھیں قید میں رکھنے کے باوجود ان کا مشاہداتی منہج عام ہو چکا تھا اور اس طرز فکر کو اب دیس نکالا دینا ممکن نہ تھا۔ مغرب میں اکتشافی علوم کی ترقی کا سہرا اسی طرز فکر کے سر جاتا ہے۔ مثال کے طور پر Leonardo da Vinci (1452-1519) کو لیجئے جو اس منہج کی اقتدا میں کہتے ہیں:

In undertaking scientific investigation I first plan a few experiments, because it is my design to base the problem on experience, and then to determine why the bodies in question are constrained to act in a given manner. This is to method that one must adopt in all researches.

۱۶۶۔ مغربی رزمیہ کا جو جتنا بڑا مغنی ہے وہ اتنے ہی زیادہ زور و شور سے فرانسس بیکن کی تقدیس کا نغمہ گاتا ہے۔ مثال کے طور پر میکالے نے اپنے مضامین میں *Novum Organum* کی بابت لکھا ہے:

No book ever made such a revolution in the mode of thinking, overthrew so many prejudices,

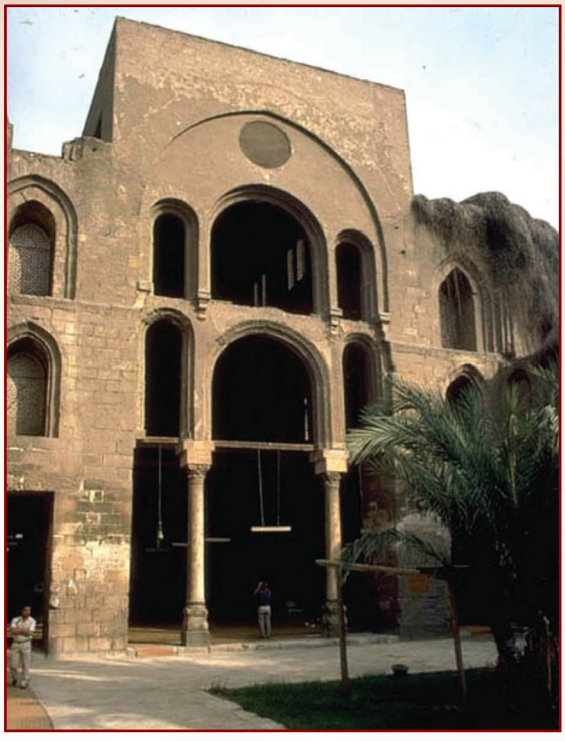

قاہرہ میں سلطان قلاوون (تیرہویں صدی) کا قائم کردہ ہسپتال

introduced so many new opinions... the glance with which he surveyed the intellectual universe reassembled that with which the archangel, from the golden threshold of heaven, darted down into the new creation.

۱۶۷۔ ملاحظہ کیجیے ایڈمنڈ برک کے یہ الفاظ:

Who is there that upon hearing the name of Lord Bacon does not instantly recognize every thing of genius the most profound, everything of literature the most extensive, everything of discovery the most penetrating, everything of observation of human life the most distinguished and refined.

(The Works of the Right Honorable Edmund Burke, vol.11, London, MDCCCLXXXVII)

۱۶۸۔ محولہ David C. Lindberg S. Westman, *Reappraisals of the Scientific Revolution* pages XVII

۱۶۹۔ حوالہ مذکور

۱۷۰۔ حوالہ مذکور

۱۷۱۔ مثال کے طور پر Thomas Sprat نے رائل سوسائٹی کی تاریخ ۱۶۶۷ء میں اس خیال کا اظہار کیا کہ عہد جدید کے مؤسسین نے قدماء سے صرف اختلاف پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ انھوں نے اپنے لیے ایک صحیح منہج کی نشان دہی بھی کی ہے، جہاں تجربہ سے یقین کا احساس ہوتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

"Latitudinarianism and the 'Ideology' of the Early Royal Society: Thomas Spratt's History of the Royal Society (1667) Reconsidered." in Michael Hunter, *Establishing the New Science: The Experience of the Early Royal Society,* Woodbridge, 1989.

۱۷۲۔ Joseph M. Levine, "Ancients, Moderns and History: The continuity of English Historical writing in

the later seventeenth century", i*n Studies in Change and Revolution: Aspects of English Intellectual History, 1640-1800,* ed. Paul J. Korshin, Menston,1972, pp.43-75

۱۷۳۔ مغربی مورخین اور تجزیہ نگار انیسویں صدی میں مغرب کی اچانک سربلندی کے اسباب کا صحیح تجزیہ کرنے میں ابتدا سے ہی فریب نظر کا شکار رہے ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو وہ گمراہ کن اصطلاحیں تھیں جسے مؤرخین نے مختلف ادوار کی تفہیم کے لیے نشاۃ ثانیہ، تحریک اصلاح، عہد تجلی یا سائنسی انقلاب کا نام دے رکھا تھا اور جسے خالصتاً مغرب کی پیداوار سمجھا جاتا تھا اور جس کی ابتدا ۱۴۹۲ء یعنی کولمبس کے بحری سفر سے بتایا جاتا تھا اور جس میں مبہم طور پر سقوط غرناطہ کی طرف بھی اشارہ مقصود تھا۔ اس تاریخ نگاری نے رفتہ رفتہ اتنا اعتبار حاصل کرلیا کہ کیرن آرم اسٹرانگ جیسی مشرق پسند خاتون نے بھی جب اپنی مشہور زمانہ تالیف *The Battle for God* کی ابتدا کی تو انھیں آغاز کے لیے ۱۴۹۲ء ایک فطری، تاریخی نقطہ معلوم ہوا۔ حالانکہ تاریخی حقائق سے معمولی شد بد رکھنے والا شخص بھی یہ جانتا ہے کہ پندرہویں صدی کے آخری ایام میں ایک نئے یورپ کی تشکیل کا کوئی واہمہ کسی عاقل و بالغ کے حاشیۂ خیال میں بھی نہ آسکتا تھا۔ پھر میکس ویبر کا یہ کہنا کہ مغربی ذہن اپنی فطری عقل پسندی اور جذبۂ اکتشاف کے سبب بالآخر ایک نئی تہذیب کی قیام کا سبب بنا ہے۔ دراصل ایک چشم مجبور کا بیان ہے جو سدھائے ہوئے گھوڑے کی طرح اپنی آنکھوں پر پڑی پٹی کے سبب حقائق کا سیدھا نہیں بلکہ سادہ لوح ادراک رکھتا ہے۔ Eric L. Jones نے اس قبیل کے سادہ لوحوں کے لیے *The European Miracle* (1981) کے نام سے ایک بڑی دلچسپ اور چشم کشا کتاب لکھی ہے۔

۱۷۴۔ Molefi Kete Asante, *The Afrocentric Idea,* Philadelphia, 1987, p.4

۱۷۵۔ ملاحظہ کیجئے: W.W. Rostow کی کتاب *Stages of Economic Growth* (1962) اور *How it all Began* (1975)

۱۷۶۔ محولہ: Carlo M. Cipolla, *Public Health and the Medical Profession in the Renaissance,* 1976, p.276

۱۷۷۔ مرکیٹر (۹۴-۱۵۱۲ء) کی نقشہ نگاری نے مغرب کو دنیا کے مرکزی اسٹیج پر غالب مقام عطا کرنے میں کلیدی رول ادا کیا ہے۔ سولہویں صدی میں پرنٹنگ پریس کے عام ہوجانے اور بحری سفر میں مغرب کی بڑھتی دلچسپی کے سبب وسیع پیمانے پر مفصل نقشوں کی طباعت کی ضرورت محسوس ہوئی۔ نقشوں کی طباعت اس بات کا متقاضی تھی کہ بیضوی دنیا کو کاغذ کے مسطح صفحات پر پھیلا دیا جائے۔ مرکیٹر نے بیضوی حقائق کو مسطح ورق پر منتقل کرنے میں اصل جغرافیائی حقائق کا خیال نہ رکھا۔ شاید اسے یہ مسئلہ درپیش رہا ہو کہ ارض البلد تو خط استواء کے حوالے سے متعین ہوجاتا ہے، البتہ طول البلد کی ابتدا کا کوئی حتمی اصول نہیں ہے۔ مرکیٹر نے یہ نقشہ چونکہ اہل مغرب کی بحری سہولتوں کے لیے تیار کیا تھا، اس لیے فطری طور پر اس نے یوروپ کو نقطہ آغاز کے طور پر اختیار کیا، البتہ اس سعی میں جغرافیائی حقائق بری طرح مسخ ہوکر رہ گئے۔ جغرافیائی حقائق تو اس خیال کے داعی ہیں کہ جنوبی کرۂ ارضی میں خشکی کے علاقے شمالی کرۂ ارضی کے مقابلہ میں دوگنے ہیں، لیکن اس کے برعکس

ڈومینیکو بارٹولو کی اس مصوری (۱۴۴۱-۴۲ء) میں سانتا ماریا ہسپتال میں ابتدائی جوش وخروش کا ایک منظر

مرکیٹر کے نقشہ میں شمالی نصف کو جنوب کے مقابلہ میں دوتہائی بڑا دکھایا گیا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اسکینڈینویا جو دراصل ہندوستان کے مقابلہ میں ایک تہائی رقبہ کا حامل ہے، مرکیٹر کے نقشہ میں چین کا دوگنا دکھائی دینے لگا۔ اسی طرح براعظم افریقہ کے مقابلے میں گرین لینڈ کا رقبہ ۱۴ گنا کم ہے، لیکن مرکیٹر کے نقشے میں ان دونوں کا رقبہ تقریباً یکساں نظر آنے لگا۔ جب حقائق کو سائنسی اور علمی سطح پر اس طرح توڑنا مروڑنا ممکن ہو تو یورپ کو براعظم قرار دینے اور ہندوستان کو برصغیر کا درجہ دینے سے کون روک سکتا تھا۔ مصیبت یہ ہے کہ عرصہ ہائے دراز سے اس غیر علمی اور غیر سائنسی نقشہ کی دنیا پر حکومت ہے۔ تعلیمی اداروں سے لے کر تحقیقی مراکز تک اسی خیالی نقشہ کی حکمرانی ہے۔ ۱۹۷۴ء میں Arno Peters نے اس فریب کا پردہ چاک کرنے کی پہلی باضابطہ کوشش کی۔ اس نے ایک ایسا نقشہ تیار کیا جس میں دنیا کے ممالک کو ان کے اصل جغرافیائی رقبہ کے مطابق جگہ دی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جنوب کے مقابلہ میں شمال بونا نظر آنے لگا۔ مغرب کے تسلط اور اس کی جغرافیائی مرکزیت اور عظمت کا طلسم پاش پاش ہو گیا، لیکن آرتھر روبنسن جیسے بظاہر بااثر نقشہ نگاروں نے اسے یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ پیٹر کا نیا نقشہ کوئی خوشگوار تاثر قائم نہیں کرتا۔ بقول ان کے ایسا لگتا ہے جیسے کسی نے بھیگے اور بدنما انڈرویئر کو خشک ہونے کے لیے باہر لٹکا دیا ہو۔ بھلا کوئی ایسی کوشش جو مغرب کے مقبول عام اسطورہ کی بیخ کنی پر منتج ہو کیسے قابل قبول ہو سکتی تھی۔ اسے ہٹ دھرمی اور فریب دہی کے علاوہ اور کیا کہا جائے گا کہ ادراکِ حقائق اور سائنسی اطلاعات کے اس عہد میں جدید دنیا کے

لیے آج بھی مرکیٹر کا تراشیدہ نقشہ آخری حوالے کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔

۱۷۸۔ اشارہ ہے Martin Lewis اور Keren Wigen کی کتاب *The Myth of Continents* (1997) کی طرف۔

۱۷۹۔ Andre Gunder Frank, *ReORIENT: Global Economy in the Asian Age,* Berkeley: University of California Press, 1998, p.11

۱۸۰۔ K. N. Chaudhuri, "Reflections on the Organizing Principle of Premodern Trade" in *The Political Economy of Merchant Empires,* James D. Tracy (ed.), p.430.

۱۸۱۔ ملاحظہ کیجیے: Paul Bairoch, *Victoires et déboires: Histoire économique et sociale du monde du XVIe siècle à nos jours*. 3 vols. Paris, 1997: vol.2, pp.517-37

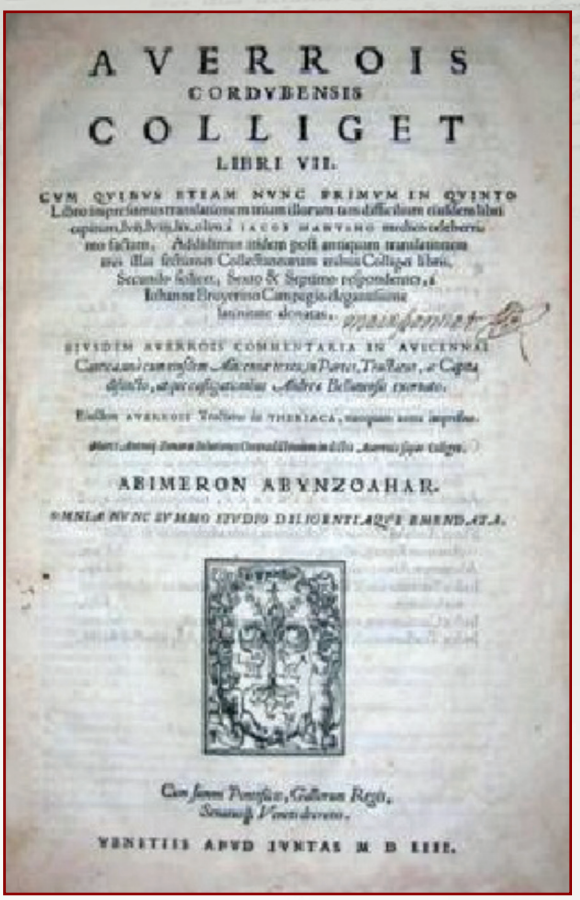
AVERROIS
CORDVBENSIS
COLLIGET
LIBRI VII.
CVM QVIBVS ETIAM NVNC PRIMVM IN QVINTO
ABIMERON ABVNZOAHAR.
VENETIIS APVD IVNTAS M D XXXX.

ابن رشد کے لاطینی ترجموں پر مبنی ۱۶ویں صدی یورپ میں رائج طب کی درسی کتاب کا سرورق

۱۸۲۔ William Falcner کا یہ قول Philip Curtin نے اپنی کتاب میں نقل کیا ہے۔ ملاحظہ کیجیے: Philip D.Curtin, *The Image of Africa* (Madison: University of Wisconsin Press, 1964), pp.65-6

۱۸۳۔ محولہ: Ronald Hyam, *Britain's Imperial Century, 1815-1914: a Study of Empire and Expansion,* London, 1976, p.81

۱۸۴۔ Raghavan Iyer, *The Glass Curtain between Asia and Europe* (London: Oxford University Press, 1965), p.20

۱۸۵۔ مغرب نے مشرق پر اپنے تسلط کے جواز اور استعماری عزائم کو برحق ثابت کرنے کے لیے مشرق کا ایک ایسا تصور وضع کیا جس کے مطابق مغرب مشرق کا ضد قرار پایا۔ ہر خوبی مغرب کے ساتھ وابستہ ہوگئی اور ہر خرابی مشرق کا جزو لاینفک قرار پائی۔

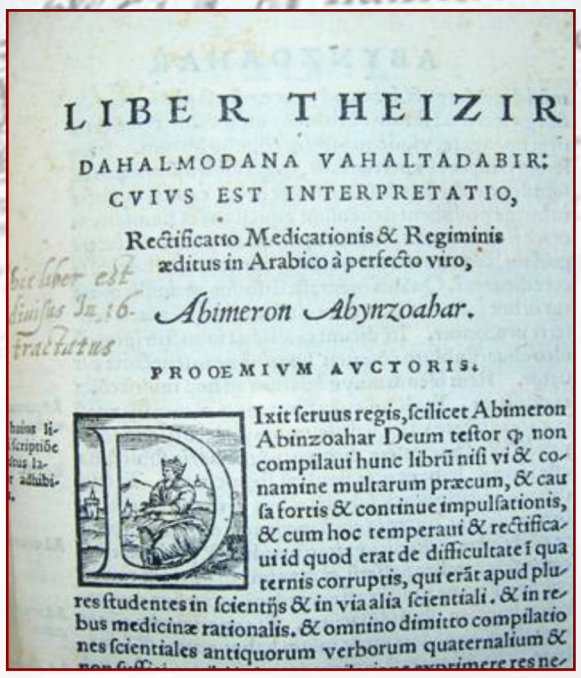

LIBER THEIZIR

DAHALMODANA VAHALTADABIR:

CVIVS EST INTERPRETATIO,

Rectificatio Medicationis & Regiminis aeditus in Arabico à perfecto viro,

Abimeron Abynzoahar.

PROOEMIVM AVCTORIS.

DIxit seruus regis, scilicet Abimeron Abinzoahar Deum testor quod non compilaui hunc librũ nisi vi & conamine multarum præcum, & causa fortis & continue impulsationis, & cum hoc temperaui & rectificaui id quod erat de difficultate i quaternis corruptis, qui erãt apud plures studentes in scientijs & in via alia scientiali. & in rebus medicinæ rationalis. & omnino dimitto compilationes scientiales antiquorum verborum quaternalium &

١٦ویں صدی یوروپ میں ابن زہر کے لاطینی ترجموں پر مبنی ایک مقبولِ عام کتاب کا پہلا صفحہ

آنے والے دنوں میں مشرقی انسان کے مقابلے میں مغربی انسان یعنی سفید فام نسل کے تفوق کا اس زور و شور سے پروپیگنڈہ ہوا کہ اس کی عقلیت پسندی، تحمل وتدبر، سخت کوشی، روشن خیالی، ایمان داری، حریت فکری، مستقبل شناسی اور اس کی ناقابل بیان خلاقانہ صلاحیتوں پر اہل مشرق بھی ایمان لے آئے۔ یہ بات غیر شعوری طور پر ان کے دل و دماغ میں کچھ اس طرح بیٹھ گئی کہ وہ آج بھی اقوام مغرب کے مقابلے میں خود کو نسبتاً کم تر مخلوق تصور کرتے ہیں۔ ان کے دانشوروں کی زبانیں آج بھی اہل مغرب کی مدح وتوصیف اور اپنے ہم وطنوں کے لیے لعن طعن میں ڈوبی ہوتی ہیں۔ حالانکہ گزشتہ نصف صدی میں خود مغرب کی دانش گاہوں میں مشرق نژاد شہریوں نے نہ صرف یہ کہ اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے بلکہ اس تہذیب کی چمک دمک کو قائم رکھنے میں وہ ان کے شریک وسہیم رہے ہیں۔

١٨٦۔ اسے محض اتفاق پر محمول نہیں کیا جاسکتا کہ انیسویں صدی، جو مغربی رزمیہ کی تشکیل کا عہد ہے، اسی عہد میں مغرب میں عمرانی علوم کی باقاعدہ ابتدا ہوئی۔ اب تک مشرق کے خلاف غصہ، عناد، حسد اور نفرت نے احتجاج کی شکل لے رکھی تھی، اب اسے علمی اور سائنسی بنیاد فراہم کیا جانے لگا۔ معاملہ ڈارون کی سائنٹفک ریسیزم کا ہو یا انتھروپولوجیکل نہج کی تراش خراش کا، ان سب کا مقصد سفید فام نسل کی فطری برتری کو ثابت کرنا تھا۔ آگے چل کر اس خیال پر دلیل قائم کرنے کے لیے *Rise of the (Christian) West* جیسی کتابوں کی اتنی کثرت ہوگئی کہ اس گمراہ کن پروپیگنڈہ پر علمی تحقیق وتجزیہ کا گمان ہونے لگا۔

١٨٧۔ جرمن ماہر عمرانیات میکس ویبر علمی حلقوں میں اپنے معروضی تحلیل وتجزیہ کے سبب احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں، لیکن ذرا گہرائی سے جائزہ لیجئے تو پتہ چلتا ہے کہ بظاہر علم وتحقیق کے علمی لبادے میں یہاں بھی ایک مغربی مغنی کا ذہن کارفرما ہے۔ ویبر نے اس بنیادی سوال کا جواب فراہم کرنے کی کوشش کی ہے کہ آخر کیا وجہ ہے جس نے جدید سرمایہ داری کے ظہور کو مغرب میں ممکن بنادیا جبکہ ان کے بقول مشرق غربت وافلاس کا شکار رہ گیا۔ اوّل تو یہ مفروضہ ہی غلط ہے جس سے کچھ اور

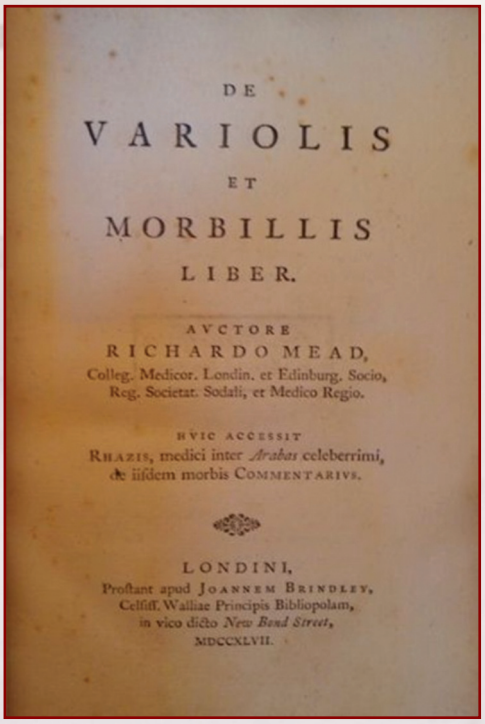

نہیں تو کم از کم عالمی تاریخ سے ویبر کی سخت ناواقفیت کا پتہ چلتا ہے۔ ہم پہلے بھی خود مغربی مصادر کے حوالے سے یہ بتا چکے ہیں کہ اٹھارویں صدی کے خاتمہ تک یا محتاط انداز سے یہ کہہ لیجئے کہ ۱۷۷۶ء میں جب آدم اسمتھ کی کتاب *Wealth of Nations* لکھی گئی ہے، مغربی مفکرین کے ذہنوں پر مشرق کی مرفہ الحالی کا احساس نمایاں تھا۔ ہندوستان اور چین جیسے ممالک اور قاہرہ اور بغداد کے الف لیلوی شہر مغرب میں طلسماتی جاہ وحشم کے لئے مشہور تھے۔ پھر یہ سوال ہی لغو ہے کہ مغرب یونان و روم سے ہوتا ہوا جدید سرمایہ داری کی منزل پر کیسے پہنچ گیا۔ اصل سوال یہ ہونا چاہیے تھا کہ انیسویں صدی میں اچانک مشرق کی سطوت کو کیوں زوال آ گیا؟ وہ مغرب کی جارحیت اور اس کے استعمارانہ عزائم کا مقابلہ کرنے میں کیوں ناکام رہا اور پھر یہ کیسے ممکن ہوا کہ اسلامی مشرق جو اپنے ظہور کے بعد سے مسلسل عالمی سیادت کے منصب پر فائز تھا، جس کی

DE
VARIOLIS
ET
MORBILLIS
LIBER.
AVCTORE
RICHARDO MEAD,
Colleg. Medicor. Londin. et Edinburg. Socio,
Reg. Societat. Sodali, et Medico Regio.
HVIC ACCESSIT
RHAZIS, medici inter *Arabas* celeberrimi,
de iisdem morbis COMMENTARIVS.
LONDINI,
Proftant apud JOANNEM BRINDLEY,
Celfiff. Walliae Principis Bibliopolam,
in vico dicto *New Bond Street*,
MDCCXLVII.

رچرڈ میڈ کی کتاب جس کے سرورق پر رازی سے اخذ واستفادے کا تذکرہ موجود ہے

کتابوں کے ترجموں نے مغرب کو اکتشافی دل و دماغ اور عقلی رویہ سے آشنا کیا تھا، جس کی عسکری قوت سے سولہویں اور سترہویں صدی کا یورپ لرزہ براندام رہتا اور جسے اہل مغرب Turkish Menace کا نام دیتے اور جس کی فوجیں سترہویں صدی کے آخری ربع تک ویانا کے دروازوں پر دستک دیتیں۔ وہی مشرق اچانک انیسویں صدی میں اتنا بے بس اور مجبور محض کیسے ہوگیا کہ چھوٹے چھوٹے جزیروں سے نکل کر مٹھی بھر سفید فام اقوام نے اس پر اپنا تسلط قائم کرلیا۔ اگر سوال کو اس انداز سے مرصع کیا جاتا تو ویبر کو یقیناً ان تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں ہوتی کہ کس طرح پبلک اور پرائیویٹ اداروں کے علیحدہ قیام کے سبب جدید معاشی نظام کے قیام کا راستہ ہموار ہوتا ہے اور کس طرح عقلی اور نمو پذیر اداروں کی موجودگی معاشی ارتقا کے لیے مناسب مواقع فراہم کرتے ہیں۔

اپنی کتاب *The Religion of China* اور *The Protestant Ethic and Spirit of Capitalism* میں ویبر نے مغربی انسان کی عقلیت پسندی کا بڑے والہانہ اور واعظانہ انداز سے ذکر کیا ہے، لیکن وہ اس سوال کا جواب فراہم نہیں کرتے کہ ان کی عقلیت پسندی کا آخر سبب کیا ہے؟ نہ ہی وہ اس مفروضے کا تاریخی ثبوت فراہم کرتے ہیں کہ مغربی انسان ہمیشہ سے

اسد البحر ابن ماجد کی کتاب الفوائد فی اصول علم البحر و القوائد مطبوعہ ۱۴۹۰ء

انسانی تاریخ میں اپنی فطری عقل پسندی کے سبب کسی خاص مقام کا حامل رہا ہے کہ اگر اس مفروضے کو درست مان لیا جائے جب بھی یہ عقدہ حل نہیں ہوتا کہ آخر کیا وجہ ہے کہ مغربی انسان کا یہ فطری امتیاز عہد تاریک کے ہزار سالہ عہد میں اپنا کرشمہ دکھانے سے قاصر رہا؟

ویبر کے طریقۂ تجزیہ سے تفصیلی آگہی کے لیے دیکھئے: Randall collins, *Weberian Sociological Theory*, Cambridge, 1986, p.23. مزید دیکھئے ان کی دوسری کتابیں: *The Religion of China*, New York, 1951; *The Religion of India*, New York, 1958.

۱۸۸۔ Karl Marx and Friedrich Engels, *The Communist Manifesto*, Harmondsworth,1985, p.84

۱۸۹۔ ملاحظہ کیجئے: Karl Marx and Friedrich Engels, *The German Ideology*

۱۹۰۔ Jerry Brotton, *The Renaissance Bazaar: From the Silk Road to Michelangelo*, Oxford University Press, New York, 2002, p.185

۱۹۱۔ مثال کے طور پر Eric Jones نے اپنی مشہور زمانہ تالیف *The European Miracle* مطبوعہ ۱۹۸۱ء میں اس خیال کی پرزور وکالت کی ہے کہ جدید دنیا میں اہل یورپ کی سبقت کا راز یہ ہے کہ وہ اہل مشرق کے مقابلے میں ایک عقلی طرز فکر کے حامل ہوتے ہیں۔ ان کے ہاں آب و ہوا ایشیا اور افریقہ کے مقابلہ میں کہیں حیات افزا ہے۔ یورپ کی قلت آبادی کو بھی ایرک ایک مثبت قدر کے طور پر پیش کرتے ہیں جس کے سبب بقول ان کے اہل یورپ کی مرفہ الحالی قائم ہے۔ گزشتہ برسوں میں ایرک کے اس نقطہ نظر کی صحت پر باوزن علمی اعتراضات عائد ہوتے رہے ہیں بلکہ یہ کہہ لیجئے کہ اہل

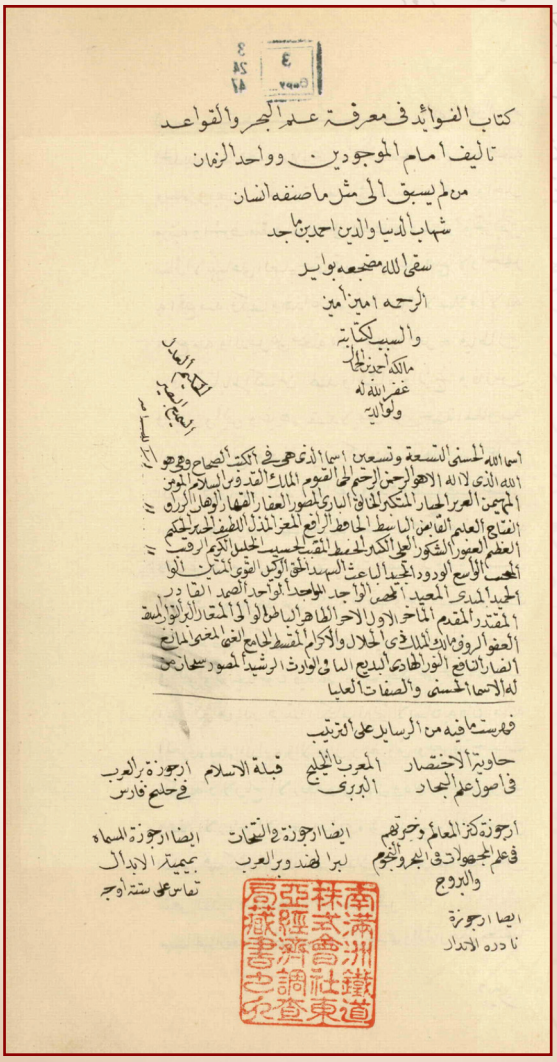

فکر کی ایک قابل ذکر تعداد ان متعصّبانہ پروپیگنڈے کو علمی تحقیق کے مغائر سمجھتی رہی ہے۔ مثال کے طور پر ملاحظہ کیجئے:

Abu-Lughod, *J. Before European Hegemony: The world system A.D. 1250-1350,* New York, 1989. Blaut, J., "Colonialism and the Rise of Capitali*sm". Science and Society* vol.53, 260-296*, 14*92, New Jersy, 1992; Brading, D., and Cross, H., "Colonial Silver Mining: Mexico and Per*u", Hispanic- American Historical Review vol.52, 545-70*; Frank, A.G.*, Capitalism and Underdevelopment in Latin America,* New York, 1968.

۱۹۲۔ محولہ: Jerry Brotton, *The Renaissance Bazaar,* Oxford, 2002, p.180.

ﻛﺘﺎﺏ ﺍﻟﻔﻮﺍﺋﺪ ﻓﻲ ﻣﻌﺮﻓﺔ ﻋﻠﻢ ﺍﻟﺒﺤﺮ ﻭﺍﻟﻘﻮﺍﻋﺪ
تالیف امام الموجودین وواحد الزمان
من لم یسبق الی مثل ما صنفه انسان
شهاب الدنیا والدین احمد بن ماجد
سقی الله مضجعه بوابل
الرحمه امین امین
والسبب لکتابته
مالکه احمد بن الحاج
غفر الله له
ولوالدیه

اسماء الله الحسنی التسعة وتسعین اسما الذی هی فی الکتب الصحاح وهی هو
الله الذی لا اله الا هو الرحمن الرحیم الحی القیوم الملک القدوس السلام المؤمن
المهیمن العزیز الجبار المتکبر الخالق الباری المصور الغفار القهار الوهاب الرزاق
الفتاح العلیم القابض الباسط الحافظ الرافع المعز المذل اللطیف الخبیر الحکیم
العظیم الغفور الشکور العلی الکبیر الحفیظ المقیت الحسیب الجلیل الکریم الرقیب
المجیب الواسع الودود المجید الباعث الشهید الحق الوکیل القوی المتین الولی
الحمید المبدی المعید المحصی الواجد الماجد الواحد الصمد القادر
المقتدر المقدم المؤخر الاول الاخر الظاهر الباطن الوالی المتعالی البر التواب المنتقم
العفو الرؤف مالک الملک ذی الجلال والاکرام المقسط الجامع الغنی المغنی المانع
الضار النافع النور الهادی البدیع الباقی الوارث الرشید الصبور سبحان من
له الاسماء الحسنی والصفات العلیا

فهرست ما فیه من الرسایل علی الترتیب
حاویة الاختصار فی اصول علم البحار
المعرب بالخلیج البربری
قبلة الاسلام
ارجوزة بر العرب فی خلیج فارس
ارجوزة کنز المعالم وخبرتهم فی علم المجهولات فی البحر والنجوم والبروج
ایضا ارجوزة فی النخات لبر الهند وبر العرب
ایضا ارجوزة المسماه بمیمیة الابدال تقاس علی ستة اوجه
ایضا ارجوزة نادرة الابدال

南滿洲鐵道株式會社東亞經濟調查局藏書之印

۱۹۳۔ ڈاکٹر عبدالقادر جیلانی نے سرخ ہندیوں کے سلسلے میں ایک دلچسپ واقعہ نقل کیا ہے، لکھتے ہیں: ''مسولینی (Benito Mussolini, 1883-1945) کے ایک اطالوی سینیٹر کو نیوانگلینڈ یونیورسٹی کا پریزیڈنٹ، لائبریری کا معائنہ کروارہا تھا۔ اس لائبریری کی سب سے نادر کتاب بائیبل کا وہ نسخہ تھا جو سترہویں صدی عیسوی میں ان 'سرخ ہندیوں' (Red Indians) کی زبان میں ترجمہ کرکے شائع کیا گیا تھا، جو کسی زمانے میں 'نیوانگلینڈ' کے اصل باشندے تھے۔ سینیٹر اس نسخے کو دیکھ کر بیحد مسرور ہوا۔ اس نے پوچھا کہ کیا یہ کتاب بیحد نایاب ہے؟ یونیورسٹی کے پریزیڈنٹ نے نہایت فخر سے جواب دیا کہ روئے زمین پر اب اس کے چھ نسخے بھی نہیں مل سکتے۔ سینیٹر نے یہ سن کر کہا کہ تب تو ریڈ انڈین اس کتاب کو نہ پڑھ سکتے ہوں گے۔ پریزیڈنٹ نے روانی میں کہا کہ اب ریڈ انڈین ہی نہیں رہے تو پڑھے گا کون؟ اطالوی سینیٹر نے پوچھا: کیوں؟ ریڈ انڈین کیا ہوگئے؟

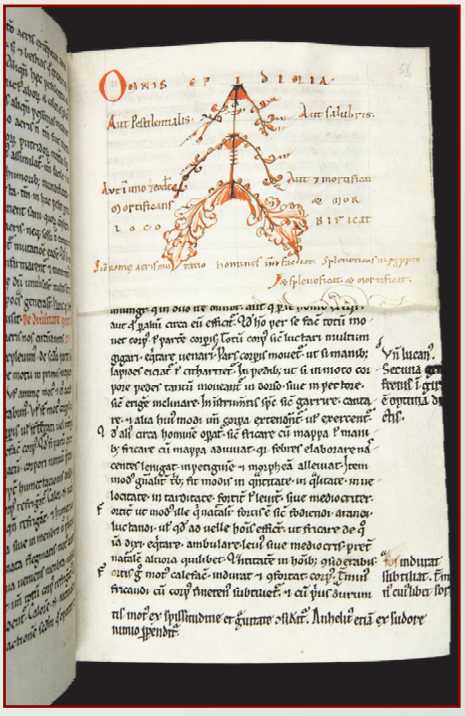

علمِ طب پر علی ابن عباس کی شہرۂ آفاق کتاب الملکی کا ہزار سالہ پرانا لاطینی ترجمہ جسے قسطنطین الافریقی نے انجام دیا تھا گذشتہ سال فن لینڈ کی قومی لائبریری نے بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے۔ اوٹی کالیٹو کے اس جدید لاطینی ترجمہ نے پہلی بار جدید دنیا کو ایک قدیم علمی خزانہ سے براہ راست روشناس کرایا ہے۔ اس کتاب کے ستر سے زائد لاطینی نسخے یوروپ کی مختلف لائبریریوں میں موجود ہیں۔ علوم عربیہ یا اکتشافی علوم کے سات لاکھ سے زائد مسودے صرف ٹمبکٹو کی مختلف لائبریریوں میں اشاعت کے منتظر ہیں۔ عالمِ اسلام کے مختلف حصوں میں موجود لاکھوں مسودات کا اگر عشر عشیر بھی منظر عام پر آجائے تو اس مفروضہ کے غبارے سے ہوا نکل جائے گی کہ جدید دنیا مغرب کی تعمیر کردہ ہے۔ بلکہ سچ پوچھئے تو ہمارے غور وفکر کا انداز یکسر بدل کر رہ جائے گا۔

پر یزیڈنٹ سٹپٹا گیا، پھر سنبھلا اور کہنے لگا کہ بس ناپید ہو گئے۔'' (ڈاکٹر عبدالقادر جیلانی، اسلام، پیغمبر اسلام ﷺ اور مستشرقین کا انداز فکر، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص ۳۷

۱۹۴۔ محولہ Jerry Brotton, *The Renaissance Bazaar,* Oxford, 2002, p.181

۱۹۵۔ ایضاً، ص ۱۸۲

۱۹۶۔ محولہ Radell, D.R. (1976), "The Indian slave trade of Nicaragua during the 16th century". *in The Native Population of the Americas in 1492* (W. Denevan, ed.)

۱۹۷۔ یورپ کی معیشت پر فتح امریکہ کے فوری اثرات پڑے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق سترہویں صدی کے وسط تک کم از کم ایک سو اسّی ٹن سونا اور سترہ ہزار ٹن چاندی یورپ کو منتقل ہو چکی تھی۔ ہوسکتا ہے اصل مقدار اس سے بھی کئی گنا زیادہ ہو۔

ملاحظہ کیجئے: Blaut, J.M., *1492,* New Jersey, 1992, pp.38, 39

"نئے دماغ کی تیاری اور متحدہ مسلم شخصیت کی تعمیر کے لیے ایک ایسی دانش گاہ کا قیام بڑے انقلابی نتائج کا حامل ہوسکتا ہے جہاں سب کچھ ازسرنو کر دکھانے کا عزم پایا جاتا ہو۔ ایک ایسی تقلیبِ فکری جو ماضی کو عبرت کے لیے پڑھتی، حال کو تحلیل و تجزیہ کی میزان پر پرکھتی اور مستقبل کو بصیرت کی روشنی میں دیکھنے کی اہل ہو۔"

پس نوشت

ایک نئی یونیورسٹی کا منصوبہ

”آج بھی جو لوگ ایک نئی یونیورسٹی کا ڈول ڈالیں گے انھیں اس بات کا خاص طور پر التزام کرنا ہوگا کہ یونیورسٹی کی بنیاد اس تصورِ حیات پر رکھی گئی ہو جس سے قرآن کی دعوتِ تسخیر و اکتشاف عبارت ہے۔ ایک آفاقی، الہامی اور زندگی بخش تصورِ حیات کے بغیر قائم کی جانے والی ہر دانش گاہ خواہ وہ اپنے مظاہر میں کتنی ہی خیرہ کن کیوں نہ ہو اور وسائل کی بہتات نے اس پر زندگی کا کتنا ہی دبیز ملمع کیوں نہ چڑھا دیا ہو ان کی اصل حیثیت روح سے خالی نالج انڈسٹری سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔“

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مسلم ذہن ایک کربناک تشنج سے دوچار ہے۔ اس عمل پر کوئی ہزار سال کا عرصہ گزرا جب ایک کرم نما ثنویت اس کے فکری چوکھٹے میں سرایت کر گئی، تب سے اب تک اس ثنویت کے تدارک کی جتنی بھی کوششیں ہوئیں وہ بوجوہ بامراد نہ ہوسکیں۔ دین و دنیا کی اس بظاہر بے ضرر زمرہ بندی نے مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو کچھ اس طرح دولخت کر رکھا ہے کہ اب بڑے بڑوں کو اس کی شیرازہ بندی کا خیال بھی نہیں آتا۔ صورت حال کی سنگینی کا اندازہ کچھ اس بات سے لگائیے کہ صدیوں سے مسلم معاشرے میں جدید اور قدیم دو الگ الگ ذہنوں کی آبیاری ہوتی رہی ہے۔ ایک علم شرعی کا شناور ہے تو دوسرا علوم دنیا کا ماہر۔ ایک کو دوسرے سے کچھ علاقہ نہیں بلکہ ایک کا وجود دوسرے کے لیے ناقابل انگیز ہے۔ اول الذکر نے اگر علومِ شرعی کے حوالے سے آخرت پر اپنی اجارہ داری قائم کر رکھی ہے تو ثانی الذکر علومِ دنیا میں اپنی مہارت کے سبب خود کو سیادت کا سزاوار سمجھتا ہے۔ مسلمانوں کے یہ دو متحارب طبقے نہ صرف یہ کہ فکری اعتبار سے الگ الگ دنیا میں جیتے ہیں بلکہ زبان و بیان، تہذیب و معاشرت اور اپنے مخصوص ملبوسات سے بھی مسلسل اس بات کی شہادت دیتے رہتے ہیں کہ کبھی بنیان مرصوص کہی جانے والی یہ امت آج دولخت ہو کر رہ گئی ہے۔ جدید تعلیم یافتہ طبقہ امت کے زوال کے لیے روایتی علما کو موردِ الزام قرار دیتا ہے جو اس کے بقول بدلتی دنیا کی طرف مسلسل پیٹھ کیے بیٹھے ہیں جبکہ اہل جبہ کو یہ شکایت ہے کہ طبقہ جدید کی بے راہ روی اور اس کو قبولیت عامہ مل جانے کے سبب مسلمان اپنے متعینہ راستہ سے دور جا پڑے ہیں۔ ایک دوسرے کے خلاف الزامات و اتہامات کا سلسلہ گو کہ صدیوں سے جاری ہے لیکن آج بھی صورت حال یہ ہے گویا یہ دونوں باہم برسرپیکار طبقے زبانِ حال سے کہہ رہے ہوں:

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں

جس امت کو داخلی فکری محاذ پر ایک بحرانِ مسلسل کا سامنا ہو، جس کا فکری اور نظری وجود لخت لخت ہو چکا ہو اور جس کے حاملین خود کو ہر لمحہ باہم برسرپیکار پاتے ہوں، بھلا اس سے یہ کیسے توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ بیرونی محاذ پر اپنے واقعی

دشمنوں کے خلاف کوئی متحدہ، فیصلہ کن اور مؤثر کارروائی کر سکے گی۔ قوموں کی تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ اس کے عروج و زوال کا پہلا اور بنیادی محرک اس کے فکر اور اس کے اندرون سے برآمد ہوتا ہے۔ جب تک آپ کی ملی عمارت میں شگاف پیدا نہیں ہوتا دشمن کے لیے اس بات کا کوئی موقع نہیں کہ وہ اپنا نفوذ ممکن کر دکھائے۔

ماضی میں احیائے امت کی جتنی بھی کوششیں ہوئی ہیں ان کی توجہ داخلی انتشار کے تدارک پر کم ہی رہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فریق مخالف کے خلاف محاذ کھولنا تو آسان ہوتا ہے اور اس کے لیے ہنگامی حالات میں حمایت کا حصول بھی مشکل نہیں ہوتا، لیکن اس کے برعکس اپنے آپ کو فتح کرنا کچھ آسان نہیں۔ ہمارے فکری انحرافات اور داخلی خلفشار پر صدیاں گزر جانے کے بعد اب ہمیں یہ سب کچھ معمول کا عمل لگتا ہے اور شاید اسی لیے ہمارے کبار مصلحین بھی اسے قبول کیے لینے میں ہی عافیت جانتے ہیں۔ حالانکہ مسلمانوں کا مذہبی طور پر فرقوں اور مسلکوں میں منقسم ہو جانا خواہ وہ شیعہ سنی کی باہمی گروہ بندی ہو یا فقہی مسالک کی رزم آرائیاں یا علوم شرعیہ اور علوم جدیدہ کے مابین برپا نزاعِ مسلسل۔ واقعہ یہ ہے کہ جب تک اختلاف کی ان بنیادوں پر تیشہ نہیں چلایا جاتا ہم ایک نئی ابتدا تو کجا خود کو ایک سرابِ مسلسل کے سفر میں مبتلا پائیں گے۔ فجر جدید کا ہر مژدہ ہم پر ایک صبح کاذب کی شکل میں طلوع ہوتا رہے گا۔

اسلام کی ابتدائی تین صدیوں میں جب علوم شرعیہ کی اصطلاح سے ہمارے حواس نا آشنا تھے، ایک ہمہ گیر علمی تحریک نے عالم اسلامی کو اپنے جلو میں لے رکھا تھا۔ مسجدوں کے حلقۂ درس، قصہ گورایوں کی لذت بیانیاں، فقہاء کی موشگافیاں، نحویوں کی نکتہ آفرینیاں، کتّاب کے ادارے، محدثین کے حلقے اور اکتشافی علوم کی بڑھتی لَے کے سبب آگے چل کر رصدگاہوں کا قیام، یہ سب کچھ قرآنی دائرۂ فکر کا فطری شاخسانہ سمجھے جاتے۔ یہ سب ایک دوسرے کی تکمیل کرتے تھے تردید نہیں۔ گو کہ ابتدائی صدیوں میں ہی قصہ گورایوں کے غیر محتاط بیانات اور تراشیدہ روایات کی شہرت و اشاعت کے سبب ایک نئے بحران کی آہٹ صاف سنائی دیتی تھی۔ اہل علم نے اپنی بساط بھر اس فتنہ کی سرکوبی کے لیے روایات و آثار کی تنقید و تطہیر کے پیمانے وضع کیے لیکن تب بھی کسی کو اس بات کا خیال نہ آیا کہ وہ بعض علوم کو تو شرعی اور دینی قرار دے کر قبولیت تامہ بخشے اور بعض علوم کو غیر شرعی یا دنیوی قرار دے کر لائق نفریں بتائے کہ تب علم ایک وسیع اصطلاح تھی اور حکمت ضالۃ المومن کا نام تھا۔ مسلمان عالمی سیادت پر اپنے استحقاق کے سبب انسانی تہذیب اور علوم کے مجموعی ورثے پر اپنا حق سمجھتے۔ اخذ و اکتساب کی اس صحت مند روایت نے ایک انتہائی مختصر عرصہ میں اقوامِ عالم پر ان کی فضیلت قائم کر دی تھی۔

مسلم ذہن کی یہ دوئی جو آج ہمیں علومِ شرعیہ اور علوم جدیدہ کے حوالے سے نظر آتی ہے، باضابطہ طور پر تو نظامیہ بغداد کے مدارس سے منقح ہوئی، البتہ اس کی ابتدا فاطمیین کے مصر میں اس وقت ہو گئی تھی جب خلافت کے فاطمی دعویداروں نے سیاسی اور نظری پروپیگنڈے کے لیے باقاعدہ ایسے داعیوں کا ایک ہراول دستہ تیار کرنے کی ضرورت محسوس کی جو دین

و مذہب کی زبان میں فاطمیوں کے استحقاق پر دلائل قائم کرسکیں۔ مذہب کی زبان میں سیاسی استحقاق کا یہ پروپیگنڈہ اتنا مؤثر ثابت ہوا کہ جلد ہی عباسی بغداد کو نظامیہ مدرسوں کی شکل میں اصحاب شرع کے ادارے قائم کرنا پڑے۔ خلافت کے عباسی دعویداروں نے نہ صرف یہ کہ فاطمیین کے خلاف مخالفانہ پروپیگنڈے اور گمراہ کن فتاویٰ کا سلسلہ شروع کیا بلکہ کبار علمائے وقت کو باقاعدہ اس کام پر مامور کیا کہ وہ فاطمیین کے حسب ونسب پر شبہات وارد کریں اور انھیں باطل ٹھہرانے کے لیے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ رکھیں۔ غزالی کی فضائح الباطنیہ اس سلسلہ کی ایک روشن مثال ہے۔ سیاسی پروپیگنڈے کو مذہب کی زبان مل جانے کا ایک نقصان یہ ہوا کہ بڑی بڑی صلاحیتیں اور اعلیٰ دماغ اہل علم اس وقتی اور نزاعی کام پر مامور ہوگئے۔ اہل شرع کے مدارس اور صوفیاء کی خانقاہیں سرکاری نوازشوں کے سزاوار قرار پائے۔ بڑے بڑے وقف املاک اور اقطاع کے نام سے گاؤں کے گاؤں ان نزاعی اداروں کے لیے وقف کردیے گئے۔ نوبت بایں جارسید کہ غزالی جیسا عالم جو خود اس نزاع میں ایک کلیدی رول ادا کررہا تھا اور جو ان نوازشات سے خود بھی متمتع ہوا تھا وہ اس صورت حال پر خاموش نہ رہ سکا۔ اسے اس بات کا شکوہ تھا کہ اس زمانہ میں جو شخص جاہ ومنصب کا طالب ہے وہ علوم شرعیہ کی دانش گاہوں کی طرف رخ کرتا ہے کہ سماجی اور سیاسی مراتب کے ساتھ بڑے بڑے وقف املاک پر تصرف اسی راستہ سے حاصل ہوسکتا ہے۔ رہے طب اور اس جیسے دوسرے اکتشافی علوم تو ادھر کوئی اس لیے جانا پسند نہیں کرتا کہ ان علوم سے وابستگان کے لیے نہ تو سیاسی اور سماجی توقیر کا کوئی امکان ہے اور نہ ہی یہ انھیں اوقاف اور اقطاع کی سربراہی پر فائز کرسکتا ہے۔ فاطمیین کا مصر ہو یا نظام الملک کا بغداد، دونوں کو ایسے علمائے شرع کی ضرورت تھی جو مذہب کی زبان میں مؤثر سیاسی پروپیگنڈے کا کام کرسکیں اور جو ان حکمرانوں کے سیاسی استحقاق پر بزبانِ شرع دلائل قائم کرسکیں۔

روایات وآثار اور فقہ وتعبیر کو سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کرنے کے بڑے دوررس اور بھیانک اثرات مرتب ہوئے۔ آگے چل کر جب ان دو متحارب خلافتوں کی چپقلش ان کے غیاب کے سبب اپنے اختتام کو پہنچی اور یہ خلافتیں تاریخ کے اوراق میں گم ہوگئیں جب بھی سیاسی استحقاق کے ان متحارب دلائل سے ہمارا پیچھا نہ چھوٹا کہ یہ وقتی سیاسی پروپیگنڈہ علوم شرعیہ کی کتابوں میں مدون اور محفوظ ہو چکا تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ علومِ شرعیہ کی دانش گاہیں جو وقتی سیاسی ضرورت کے تحت قائم ہوئی تھیں انھیں ہمیشہ ہمیش کے لیے امت میں ایک عمومی استناد حاصل ہوگیا تھا۔ یہ خیال عام ہوا کہ علوم دو قسم کے ہوتے ہیں: ایک علوم شرعیہ جسے مذہب کے حوالے سے تقدیس کا مرتبہ حاصل ہو چکا تھا اور دوسرا علوم العجم یا علوم جدیدہ جس کی بے توقیری اس کے عجمی الاصل ہونے سے ہی مترشح تھی۔ حالانکہ علوم کی یہ تقسیم جسے پہلی مرتبہ ابوعبداللہ الکاتب الخوارزمی (متوفی ۳۸۷ھ) نے اپنی کتاب مفاتیح العلوم میں متعارف کرایا تھا کوئی سوچی سمجھی اصطلاح نہ تھی۔ یہ ایک فہرست ساز کی اپنی تراشیدہ زمرہ بندی تھی۔ اسے کیا پتہ تھا کہ آنے والے دنوں میں اس کی وضع کردہ علوم شرعیہ کی یہ اصطلاح گمراہ کن التباسات کا سبب بنے گی اور مسلمان اس التباس کا شکار ہوجائیں گے کہ بعض علوم شرعی ہیں جن کے

حاملین وارثانِ علوم نبوت کے حوالے سے تقدیس کے سزاوار ہیں جبکہ دوسرے علوم اہل عجم کے پرداختہ ہیں اور اس لیے انھیں اول الذکر جیسی توقیر حاصل نہیں ہوسکتی۔

علومِ شرعیہ کے یہ ادارے جو وقتی سیاسی مصلحتوں کے پیداوار تھے جلد ہی ایک نئی پاپائیت کا علامیہ بن گئے۔ یہ خیال عام ہوا کہ دین کی تشریح وتعبیر کا تمام تر حق علمائے شرع کو ہے جن کی مذہبی حیثیت وارثانِ علوم نبوت کے حوالے سے مستحکم ہے۔ حالانکہ ان علمائے شرع کی بنا میں ابتدا ہی سے مسلکی اور فرقہ وارانہ طرز فکر نمایاں تھا۔ ان کی سرپرستی نظام وقت کے نظری ہراول دستہ کی حیثیت سے ہی کی جاتی رہی تھی۔ علمائے ازہر اگر فاطمیین کی خلافت کو برحق ثابت کرنے پر مامور تھے تو نظامیہ بغداد کے ادارے سنی فکر کے نقیب تھے، جن کا کام آلِ عباس کے سیاسی استحقاق کو جواز فراہم کرنا تھا۔ ان متحارب اور متنازع اداروں کو علومِ شرعیہ کا قلعہ سمجھنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ اختلاف وجدال مسلم ذہن کا لازمہ بن گیا۔ یہ بات اب ناقابل تصور سمجھی جانے لگی کہ اسلام کا کوئی متحدہ پیغمبرانہ قالب بھی ہوسکتا ہے، جس پر متحارب روایتوں، سیاسی مناقشوں اور جدالِ فقہی کے اثرات نہ پائے جاتے ہوں۔ تب سے اب تک مسلم فکر سنّیت اور شیعیت کے گردابِ محوری کی کچھ اس قدر اسیر ہے کہ آج ایک متحدہ اسلامی قالب کی تشکیل کا خیال عبث معلوم ہوتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے گویا کسی ایسے اقدام سے مروّجہ اسلام کی عمارت ہی زمیں بوس ہوجائے گی۔

علوم شرعیہ کی اصطلاح ایک اور بڑے التباس کو جنم دینے کا باعث ہوئی ہے وہ یہ کہ اسلام میں تشریح وتعبیر کا حق کسی خاص طبقہ کے لیے مخصوص ہے۔ اسلام جس حریت فکری کا نقیب ہے اور قرآن مجید میں رسول اللہ کو اصر واغلال سے نجات دہندہ کے طور پر جس طرح پیش کیا گیا ہے اس کے بعد تاریخ کا اس سے بڑا طنز اور کیا ہوسکتا ہے کہ طبقہ علماء کے حوالے سے ایک نئی پاپائیت نامحسوس طور پر ہمارے ہاں متشکل ہوجائے اور ان احبارِ اسلام کی شقی القلبی انھیں باقاعدہ فتووں کے اجرا پر آمادہ کرے اور وہ زبانِ حال وقال سے اس بات کے داعی ہوں کہ وہ بندوں اور خدا کے درمیان تشریح وتعبیر کے حوالے سے ایک مقامِ خاص کے حامل ہیں۔ حالانکہ ان فتووں کی نقیض خود ان فتووں سے مسلسل ہوتی رہتی ہے کہ ایک عالم کا فتویٰ دوسرے سے متصادم اور ایک کی فقہی بصیرت دوسرے کو مسترد کررہی ہوتی ہے اور جس کے بطلان پر کسی اور کا نہیں خود قرآن کا یہ فتویٰ موجود ہے: **ولو کان من عند غیر اللہ لوجدوا فیہ اختلافاً کثیرا۔**

جن علوم شرعیہ کے حوالے سے علمائے تقدیس نے احبارِ اسلام کا منصب حاصل کررکھا تھا خود اس کی تنگنائی کا حال یہ تھا کہ وہ مکمل انسانی زندگی کا احاطہ نہیں کرتے تھے۔ علمائے شرع کی قیل وقال کا محور ومرکز صرف آیات احکام تھے جن کی تعداد حسب توفیق ڈیڑھ سو سے پانچ سو آیات شمار کی جاتی تھیں۔ باقی ماندہ قرآن مجید یا تو محض کتاب تلاوت تھا یا عملاً معطل ومنسوخ کہ آیات اکتشاف علمائے شرع کے دائرۂ کار سے باہر سمجھی جاتی تھیں۔ قرآن مجید پر علمائے شرع کی اجارہ داری سے ایک دوسرا نقصان یہ ہوا کہ اکتشافی علوم کے حاملین کا تعلق رفتہ رفتہ کتاب ہدایت سے کمزور پڑتا گیا۔ مسلم

معاشرہ جو کبھی حریت فکری کا نقیب تھا جہاں ایک بدوی عورت عمرؓ کے فہم قرآن پر برسرِ مجلس اعتراض وارد کر دیتی اور خلیفۂ وقت کو اپنے موقف سے رجوع کرنا پڑتا، علمائے شرع کے عروج کے بعد اس صحت مند مکالمہ کا کوئی موقع نہ رہا کہ اب فتویٰ کی کاٹ فتویٰ کی زبان ہی کر سکتی تھی۔ گویا تشریح و تعبیر طبقۂ علماء کا درونِ خانہ وظیفہ بن چکا تھا۔ عوام کالانعام کے لیے اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ ان متحارب فتووں میں سے ہی کسی ایک کو اپنے لیے منتخب کر لیں کہ یہ مضحکہ خیز خیال عام تھا کہ چاروں ائمہ فقہاء بیک وقت حق پر ہیں، خواہ وہ بظاہر ایک دوسرے سے متصادم کیوں نہ معلوم ہوتے ہوں۔ دین اسلام میں علوم شرعیہ کے منقح ہو جانے سے خود اسلام کی ایسی ہیئت تقلیبی ہوئی کہ رسالۂ محمدیؐ کا متحدہ قالب ہمارے ہاتھوں سے جاتا رہا۔ وقتی سیاسی نزاع نے علوم شرعیہ کے تقدیسی عمل سے جلا پا کر شیعیت اور سنیت اور اس جیسے دیگر قالب پیدا کیے اور خود ان فرقوں کے اندر بھی علوم شرعیہ اور علوم جدیدہ کے حوالے سے متبعین محمدؐ مختلف خانوں میں بٹ کر رہ گئے۔

آج جب علوم شرعیہ کی اصطلاح پر کوئی ہزار سال کا عرصہ بیت چکا ہے اور علمائے شرع کے ادارے نے دین مبین میں وارثین علوم نبوت کے حوالے سے تقدیسی اہمیت حاصل کر لی ہے، عام مسلمانوں کے لیے اس حقیقت کو تسلیم کرنا کچھ آسان نہیں کہ علوم شرعیہ کا مروّجہ تصور اور علمائے شرع کی تعبیری حیثیت ہمارے بحرانی تاریخ کی پیداوار ہے اور یہ کہ اسلام میں کسی قسم کی پاپائیت خواہ وہ سیاسی اور نسلی حوالے سے قائم ہوئی ہو، جیسا کہ خلافت کے فاطمی اور عباسی دعویداروں کا موقف تھا یا تشریح و تعبیر کے حوالے سے منقح ہوئی ہو، جیسا کہ احبارِ اسلام کا دعویٰ ہے، یہ سب کچھ دراصل دین مبین کی بنیادی تعلیمات اور اس کے مزاج سے مغائر ہے۔ خدا کی کتاب ایک ایسا لازوال عطیہ ہے جس سے ہر شخص اپنی بساط اور توفیق بھر اکتساب کا حقدار ہے۔ کسی کی سیاسی حیثیت یا علمی اختصاص اسے اس عمل میں لغزشوں سے ماورا قرار نہیں دے سکتا۔ مسلم معاشرہ بنیادی طور پر خدا سے بندے کے راست تعلق کے تصور سے غذا حاصل کرتا ہے۔ عمرؓ جیسے جلیل القدر صحابی رسولؐ کی قرآن فہمی پر ایک غیر معروف بادیہ نشین عورت شبہات وارد کر سکتی ہے۔ جنگ ردّہ کے اسیران کے سلسلے میں ابوبکرؓ کا سخت موقف عمرؓ اور دوسرے اصحابِ نبیؐ کے نزدیک غیر ثقہ قرار پا سکتا ہے اور خلیفۂ وقت اپنی تمام تر سیاسی قوت کے باوجود ان فیصلوں پر عمل درآمد سے گریز میں ہی عافیت جانتا ہے۔ جب ابوبکرؓ اور عمرؓ کا فہم قرآن چیلنج ہو سکتا ہے اور یہ حضرات اپنے موقف پر نظر ثانی یا گریز عمل کی ضرورت محسوس کر سکتے ہیں تو پھر ہما شما کے فتووں کو تقدیسی حیثیت عطا کرنے کا آخر کیا جواز ہے؟ رہے کبار فقہائے عظام جن کے حوالے سے سنی اسلام کے چار مختلف قالب کا وجود قائم ہے یا کبار شیعی مؤسسین جن کی کتب اربعہ نے شیعی اسلام کا قالب تیار کیا ہے، تو واقعہ یہ ہے کہ انھیں اس کام پر نہ تو خدا نے مامور کیا اور نہ ہی ان حضرات نے رسول اللہ یا ان کے اصحاب کی صحبت پائی۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ ان کے بغیر آج ہمیں اسلام کو متصور کرنے کا خیال ناممکن العمل معلوم ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ اب تک امت میں تجدید و اصلاح کی جتنی بھی کوششیں ہوئی ہیں وہ اس مسئلہ سے دانستاً یا نادانستاً صرف نظر کرتی رہی ہیں۔ جب تک ہم اپنی شخصیت کو پھر سے مرصع نہیں کرتے، جب تک ہم

اپنے اندرون میں جاری اس فکری اور نظری خلفشار پر قابو پانے میں کامیاب نہیں ہوتے، جو ہر لمحہ ہمیں لخت لخت کیے دیتی ہے، تب تک کسی نئی ابتدا کا خیال ان ہی پرانے دائروں میں لایعنی گردش پر منتج ہوگا۔ ایک نئی ابتدا کے لیے ایک ایسی شخصیت کی تعمیر کم سے کم شرط ہے جو تاریخ کے بجائے وحی ربانی سے راست غذا حاصل کرتی ہو، جو علوم کے اجتماعی سرمایہ سے نہ صرف یہ کہ واقف ہو بلکہ اس احساسِ گناہ سے اس کے دامن یکسر نا آلودہ ہوں کہ علومِ شرعیہ کے علاوہ دوسرے علوم کی طلب میں اس نے علم کی کسی کم تر شاخ کو اختیار کر رکھا ہے۔ رسالۂ محمدی سے اس کی واقفیت ائمہ اربعہ یا ائمہ اثنا عشر کے تراشیدہ خانوں میں الجھ کر نہ رہ گئی ہو بلکہ تاریخی اسلام سے ماوراء دین کے متحدہ اور حقیقی قالب تک اس کی رسائی ہو۔ بالفاظ دیگر یہ کہہ لیجئے کہ امت کو سیادت علیا کے منصب پر پھر سے متمکن دیکھنے کے لیے لازم ہے کہ ہم ان انحرافات و التباسات کی بساط لپیٹنے کی اپنے اندر ہمت پاتے ہوں جو تاریخ کے مختلف ادوار میں ہمارے ہاں در آئی ہیں اور جنھیں بدقسمتی سے ہم دین اسلام کا حقیقی قالب سمجھنے کی غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔

اس بات کی صداقت سے بھلا کون انکار کر پائے گا کہ ہمارے سیاسی زوال اور نظری التباسات و انحرافات کا ایک بنیادی عامل سیاسی نزاع کو مذہب کی زبان مل جانا رہا ہے جس نے آگے چل کر باقاعدہ شیعہ سنی خانہ جنگی کی حیثیت اختیار کر لی۔ اس نزاع نے ہمیں جس طرح دولخت کیا اور جس طرح ہماری تاریخ اس باہمی معرکہ آرائی سے لہولہان ہے، اس کی کربناکیوں کو کون محسوس نہیں کرتا؟ تب فاطمیوں کی خلافت یا آلِ بویہ کی امیر الامرائی اس بات کی طالب تھی کہ ایک فرقہ وارانہ اور مسلکی قالب روز افزوں ترقی پائے۔ دوسری طرف سنی اسلام کی تشکیل عباسی خلفاء کی سیاسی ضرورت تھی جس کے بغیر مساجد کے منبروں سے **اللھم اغفر للعباس و ولدہ مغفرۃ ظاھرۃ و باطنۃ لا تغادر ذنبا** کی صدا بلند نہیں ہو سکتی تھی۔ اب جب یہ سیاسی چپقلش اور ان کے قائمین قصۂ پارینہ بن چکے ہیں کوئی وجہ نہیں کہ ان کی فکری باقیات ہمارے ملّی سفر میں مسلسل مزاحم ہوتی رہیں۔ اسی طرح علم کے سلسلے میں آج من حیث الامت ہم جن التباسات کے شکار ہیں اور جس کے سبب اکتشافی علوم پر ہماری گرفت مسلسل ڈھیلی پڑتی گئی ہے اس کے تدارک کے بغیر ہمارا ہر اقدامی عمل دراصل ہماری رجعت کی شہادت دے گا۔ ہمارے بہترین دماغ علومِ شرعیہ کے دھوکے میں جزوی، فروعی اور لاطائل بحثوں سے اشتغال جاری رکھیں گے۔ ان کا تقدیسی سایہ علم کے سلسلے میں ہمارے التباسات کو زندگی عطا کرتا رہے گا اور ہمارے اندر دو متحارب قسم کے مسلم دماغ اور مسلم شخصیتیں پیدا ہوتی رہیں گی۔ دین و دنیا کی اس ثنویت کو جب تک اعتبار حاصل رہے گا آخر کوئی ان کم تر درجہ کے علوم سے اشتغال کیوں کر رکھے گا جن کے حصول سے اسے آخرت میں کامیابی اور دنیا میں وارثِ علومِ نبوت کی تقدیسی توقیر عطا نہیں ہو سکتی۔ ایک نئی ابتدا کے لیے صرف فرقہ وارانہ تاریخ کو لپیٹنا ہی کافی نہ ہوگا بلکہ اس بنیادی التباس کا پردہ چاک کرنا ہوگا جس نے علم کی روشنی سے ہمیں محروم کر رکھا ہے اور جس کے سبب تحلیل و تجزیہ کی ہر کوشش بامراد ہونے سے پہلے ہی دم توڑ دیتی ہے۔

ہم اب تک اس خیال کے اظہار سے گریزاں رہے ہیں کہ علوم کی شرعی اور غیر شرعی کی تقسیم ایک غیر قرآنی اور گمراہ کن مغالطہ ہے، گو کہ ہمارے بعض سکہ بند علماء ماضی میں بھی زیر لب اس صورت حال پر احتجاج کرتے رہے ہیں۔ غزالی فقہ کو علومِ شرعیہ میں شمار نہیں کرتے کہ ان کے نزدیک اس کا تعلق امور دنیا سے ہے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ اس زیرِلب احتجاج کو ایک بے لاگ علمی محاکمے کی شکل دی جائے اور بلاخوف لومۃ ولائم اس بات کا برملا اعلان کیا جائے کہ علوم کی شرعی اور غیر شرعی خانوں میں تقسیم فی نفسہٖ ایک غیر شرعی خیال ہے جو خالصتاً ایک بحرانی تاریخ کی پیداوار ہے اور جس کے جواز پر کتاب وسنت سے دلیل نہیں لائی جاسکتی۔ نکاح وطلاق اور فقہ وآثار کا علم بھی شرعی ہے اور انفس وآفاق کا باریک بیں مشاہدہ اور سیر وا وانظروا کی دعوت پر لبیک کہنا بھی مطالباتِ شریعت کا ہی حصہ ہے۔ ہماری دینی دانش گاہوں میں عصری علوم کی شمولیت کا غلغلہ اگر کوئی خوش کن نتیجہ برآمد کرنے میں ناکام رہا ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ ہم علم کے سلسلے میں ان انحرافات والتباسات کا پردہ چاک کرنے میں ناکام رہے ہیں جس نے عباسی بغداد کے بحرانی لمحات میں ہمیں آلیا تھا۔ دوسری طرف عصری دانش گاہوں میں اسلامی علوم کی پیوندکاری اگر کوئی خوشگوار اثر مرتب کرنے میں ناکام رہی ہے تو اس کی وجہ بھی شرعی علوم کے سلسلے میں یہی التباسِ فکری ہے۔ مصیبت یہ ہے کہ ہم جس چیز کو شرعی علوم سمجھ بیٹھے ہیں وہ نہ صرف یہ کہ قرآنی تصورِ علم سے مغائر ہے بلکہ اس کی تشکیل وتدوین میں روزِ اوّل سے ہی ایک ناقص منہجِ علمی کو دخل رہا ہے۔ ذرا غور کیجئے تفقہ کا یہ اصول اربعہ جس میں قرآن مجید کے بالمقابل روایات وآثار، اجماع اور قیاس کو بھی یکساں اہمیت دی گئی ہو اور ان تینوں ظنی ماخذ کو بھی کتاب اللہ کے لازوال ماخذ کی طرح تعبیر وتدوین میں معتبر جانا گیا ہو، بھلا کسی ایسے منہج سے اختلافات کے علاوہ اور کیا برآمد ہوگا۔ واقعہ یہ ہے کہ ان ظنی ماخذ نے کتاب ہدایت کی تجلیوں پر التباسات کی شدید دھند قائم کر رکھی ہے۔ قرآن مجید جو وحی ربانی کا لازوال، غیر محرف اور حتمی وثیقہ ہے بسا اوقات تاریخ وآثار اور اجماع وقیاس کے تابع ہو کر رہ گیا ہے۔ جب تک اس غیر علمی منہج کو چیلنج نہیں کیا جاتا اور کتاب ہدایت کی غیر مشروط حتمی حیثیت بحال نہیں ہوتی کسی نئی ابتدا کا خیال پرانے از کارِ رفتہ خیالات کی بے لذت جگالی پر منتج ہوگا اور ہم خود کو اسی گردشِ محوری میں مبتلا پائیں گے۔

بین بین کی بات بہت ہو چکی اب یہ کہنے سے کام نہیں چلے گا کہ تمام ائمہ فقہاء حق پر ہیں۔ دراصل اس قسم کی گمراہ کن وسعت قلبی نے ہی مدت سے ہمارے فکری قافلے پر روک لگا رکھا ہے۔ ہم نہ تو کسی واقعی تحلیل وتجزیہ کی اپنے اندر ہمت پاتے ہیں اور نہ ہی ہمیں اپنے انحراف فکری کی سنگینی کا واقعی احساس ہو پاتا ہے۔ عہد عباسی کی سیاسی مصلحتیں ایک صلح جو اسلامی ملغوبے کی طالب تھیں سو سیاسی مصالح کے تحت سنی اسلام نے خلفائے اربعہ کو سوادِ اعظم کے عقیدے کے طور پر پیش کیا۔ عباسی خطبہ میں آلِ عباس کی فضیلت کے ساتھ ہی تفضیل علیؓ اور پنجتن کا ذکر بھی شامل ہوا۔ یہ سیاست دانوں کی وقتی مصلحتیں تھیں کہ انھوں نے تاریخ کو عقیدے کے طور پر پڑھنے کی کوشش کی۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ان وقتی تدابیر سے نہ تو

امت کا اختلاف ختم ہوا اور نہ ہی متحدہ اور پیمبرانہ اسلام کی طرف ہماری واپسی ہوسکی۔ بلکہ جوں جوں ہم آگے بڑھتے گئے ہمارا ملّی وجود فرقوں اور طائفوں میں بٹتا گیا۔ پھر چونکہ علم کی روشنی ہمارے ہاتھوں سے پھسل چکی تھی اور واصل بن عطا کا عطا کردہ منہج علمی، جس پر تفقہ اور تدبر کی تمام عمارت قائم تھی، غور وفکر کا آخری حوالہ بن چکا تھا جسے عبور کیے بغیر قرآنی دائرۂ فکر میں ہماری واپسی ممکن نہ تھی۔ آج ایک نئی ابتدا کے لیے نہ صرف یہ کہ ہمیں علم کی شرعی اور غیر شرعی تقسیم کو مسترد کرنا ہوگا بلکہ اس التباسِ فکری سے باہر آنے کے لیے لازم ہوگا کہ ہم اصولِ دین اور اصول فقہ کا بھی ازسرنو قرآنِ مجید کی روشنی میں بے لاگ محاکمہ کرسکیں، جبھی یہ ممکن ہے کہ ہم منہج علمی کی لغزشوں اور اس کے پیدا کردہ صدیوں پر محیط لٹریچر سے اپنے آپ کو کسی حد تک بچاسکیں۔ قرآنی تصورِ حیات کی تشکیلِ نو یا اس کی واپسی کے بغیر دینی مدارس میں عصری علوم کی شمولیت ایک بے ضرر بوجھ ہی معلوم ہوگا جس سے نہ تو شخصیت کی ثنویت ختم ہوسکے گی اور نہ ہی کسی واقعی غلغلہ انگیز مسلم ذہن کی تعمیر کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو پائے گا۔

عصری دانش گاہوں کی صورت حال بھی کچھ قابل رشک نہیں۔ دینی درس گاہوں میں اگر **وجدنا آبائنا کذالک یفعلون** کا ورد سنائی دیتا ہے تو ہماری عصری دانش گاہیں بھی تقلید غرب کا شاہکار نمونہ ہیں، جہاں خیال پیدا کرنے کے بجائے خیال درآمد کرنے پر سارا زور ہے۔ ان کی معراج اگر کچھ ہے تو یہی کہ وہ مغرب کے علمی اداروں سے خود کو زیادہ سے زیادہ ہم آہنگ کرلیں۔ ابتدا ہی سے یہ ایک طرح کے catch-up syndrome میں مبتلا ہیں جس سے کم از کم اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ یہ حضرات قرآنی دائرۂ فکر کو مہمیز کرنے، اس کے چشمۂ صافی سے جرعۂ زندگانی پینے اور علوم کا آبشار اپنے اندرون سے بہانے کے بجائے صرف باہر سے آنے والی روشنی پر اکتفاء کرنا چاہتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ وہ اپنے عظیم ماضی اور صدیوں پر محیط علمی اور سائنسی روایت سے ناواقف ہیں، جس کی روشنی بنائے مغرب میں شامل رہی ہے اور جس کے سبب آج مغرب بقعۂ نور نظر آتا ہے۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ مسلمانوں کی عصری دانش گاہوں میں بھی علومِ اسلامی کی پیوند کاری اب تک کوئی نتیجہ پیدا کرنے میں ناکام رہی ہے اور شاید اسی لیے علی گڑھ کے قیام سے لے کر OIC کی قائم کردہ اسلامی یونیورسٹیوں میں بھی اسے دینیات کے شعبہ یا اسلامیات اور علوم وحی کی فیکلٹی تک محدود رکھا گیا ہے۔ جہاں اسلامی علوم سے مراد شرعی علوم کا ناقص تصور ہو وہاں یہ بات کیسے سوچی جاسکتی ہے کہ تاریخی اسلام سے ماوراء اور مروّجہ منہج فقہی کے علاوہ بھی دین اور تعبیر دین کا کوئی انقلاب انگیز اور زندگی افزا طریقۂ کار ہوسکتا ہے۔ سرسید جنھیں عصری علوم کی ترغیب کے حوالے سے اولیت اور سبقت حاصل ہے کسی حد تک اس بات سے تو آگاہ تھے کہ دین کا مروّجہ فہم اور مطالعہ اسلامی کا مقبولِ عام منہج رسالۂ محمدی سے مغائر ہے۔ سرسید نے اپنے تہذیبی ورثہ کے سلسلے میں تو تحلیل وتجزیہ اور نقد واعتراف کا صحت مند رویہ اختیار کیا جس سے کم از کم ایک نئے علم کلام یا ازسرنو غور وفکر کی امید پیدا ہوچلی، لیکن مغرب کے سلسلے میں ان کا رویہ معتقدانہ بلکہ مقلدانہ ہونے کے سبب وہ ایک نئی علمی روایت کی بنا ڈالنے میں ناکام رہے۔ انھوں نے

کیمبرج اور آکسفورڈ کو، جن کی اسلامی طرز تعمیر پر مبنی قدیم عمارتوں کو دیکھ کر وہ مبہوت ہو گئے تھے، کو اپنے لیے نمونہ قرار دیا لیکن وہ مغربی پروپیگنڈے کے زیر اثر اس بات کو فراموش کر گئے کہ اس روایت کی داغ بیل اور اس کے ارتقاء و فروغ میں ہمارا ہی رنگ و روغن شامل ہے۔ 'علوم عربیہ'، جو عہد وسطیٰ میں اکتشافی سائنسی علوم کے لیے مستعمل اصطلاح تھی، اگر مسلمانوں کے ہاتھوں یورپ کو منتقل نہ ہوئے ہوتے اور اگر صقلیہ اور اندلس کی مسلم دانش گاہوں میں عہد وسطیٰ کے یوروپی علماء کی تعلیم و تربیت کا انتظام نہ ہوا ہوتا، اگر گیارہویں صدی سے لے کر سولہویں صدی تک سائنس اور ٹیکنالوجی کی عربی کتابیں لاطینی اور دوسری مغربی زبانوں میں مسلسل ترجمہ نہ ہوتی رہتیں تو مغرب کی خیرہ کن سائنسی تہذیب جس سے سرسید مبہوت ہو گئے تھے، وجود میں نہ آسکتی تھی۔ اپنے عہد کے دوسرے علماء کی طرح سرسید بھی بدقسمتی سے سفید فام انگریزوں کی نسلی، سیاسی اور تہذیبی برتری پر ایمان لے آئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اپنی تہذیبی روایت میں ایک نئے باب کے آغاز کے بجائے علی گڑھ نے پوری طرح مغرب کی علمی روایت کو بغیر کسی تحلیل و تجزیہ کے قبول کر لیا۔ انھوں نے بڑے خلوص کے ساتھ بعض دیانت دار انگریزوں کو علی گڑھ میں مسلمانوں کی نئی نسل کو تہذیب سے مزین کرنے کی خدمت پر مامور کیا، لیکن اس پوری تگ و دو میں یہ بات نگاہوں سے اوجھل ہو گئی کہ علی گڑھ کو آکسفورڈ اور کیمبرج کا چربہ بنانے کی یہ کوشش چربہ دل و دماغ ہی پیدا کر سکتے تھے۔ طبع زاد اور قائدانہ دل و دماغ اس روایت میں تشکیل نہیں پاتے جو ہر لمحہ کسی catch-up syndrome میں مبتلا ہو۔ جلد ہی قدیم علمی روایت، اجتہاد و اصلاح کی غلغلہ انگیز بحثیں، روایتی علوم کے شعبوں میں جزو مہمل بن کر رہ گئیں۔ خود سرسید کی ذاتی فہم و بصیرت اور تفسیر و تعبیر کا عظیم الشان علمی منہج علی گڑھ کی مقلدانہ فضا میں کارِ لایعنی قرار پایا۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ علی گڑھ اپنے بانی کی حریت فکری اور ان کی مجتہدانہ فکر و بصیرت سے مسلسل مزاحم ہوتا رہا ہے۔ علی گڑھ کی خدمات اپنی جگہ لیکن یہ سب کچھ اس بہت بڑی قیمت کے سبب ہے جو اس کے بانی کو اپنے اصل عزائم سے مصالحت کی شکل میں ادا کرنا پڑی۔

عبدہٗ کا ازہر ہو یا شبلی کا ندوہ یا اس قبیل کی تجدیدِ نصاب کی دوسری کوششیں، اس میں شبہ نہیں کہ سرسید کے مقابلے میں ان حضرات کو ایک جاری، گو کہ مضمحل، روایت کی بنیاد حاصل تھی لیکن یہ ایک منحرف روایت تھی جو وحی ربانی سے کہیں زیادہ قدمائے یونان کی قیل و قال کی پروردہ تھی۔ پھر قدیم و جدید کی کوئی کوشش کسی نئی اسلامی صبح کی ضمانت کیسے دے سکتی تھی۔ ازہر ہو یا ندوہ منہج تعبیر میں وہ اپنے حریفِ مقابل دیوبند سے کچھ مختلف نہ تھا بلکہ آگے چل کر جب ابوالاعلیٰ مودودی نے علی گڑھ کو سخت تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے ایک نئے نظامِ تعلیم کا خاکہ پیش کیا تو وہاں بھی ان کی نگاہیں مروّجہ علوم شرعی کی تدوین میں الجھ کر رہ گئیں۔ اکتشافی علوم ان کی توجہ کا مرکز نہ بن سکے۔ شاید اس کا سبب یہ رہا ہو کہ یہ تمام حضرات اصلاح و تجدید کے شدید داعیات کے باوجود اسلام کے متوارث فہم کو اس کا اصل الاصل قرار دے بیٹھے تھے۔ قرآن مجید سے راست اکتساب کے تمام تر دعاوی کے باوجود ائمہ اربعہ کے خیمے سے وابستگی کو جزو ایمان جانتے تھے۔ کلامی منہج کی مضرتوں

پر اپنی وقیع تنقید کے باوجود ایک نئے منہج علمی کا ڈول ڈالنا امر محال سمجھتے تھے کہ اس سے متوارث اسلام کی تاریخی بنیاد ہل جاتی تھی۔ ان میں سے کوئی سنی تھا اور کوئی سنی حنفی یا شافعی یا حنبلی۔ زندگی بھر کا مطالعۂ اسلامی انھیں ان تراشیدہ انسانی حوالوں سے آزاد نہ کر سکا۔ پھر یہ کیسے ممکن ہوتا کہ وہ ائمہ اربعہ سے ماورا، شیعہ سنی فرقہ بندیوں سے اوپر اٹھ کر اسلام کی اس متحدہ اور غیر محرف علمی روایت کی تشکیل کر پاتے جو حاملین کتاب کے ہاتھوں کتاب کائنات کے والہانہ مطالعہ سے عبارت ہے۔

ایک نئی ابتدا بالکل ہی نئے انقلابی اقدامات کی طالب ہے۔ غور وفکر کے پرانے سانچے جب تک نہیں ٹوٹتے ایک نئے شاکلے کی تشکیل نہیں ہوسکتی۔ بالفاظ دیگر یہ کہہ لیجئے کہ آج جب ہمارے علمی التباسات اور منہجی انحرافات پر کوئی ہزار سال کا عرصہ بیت چکا ہے نئے اقدامات کے لیے کم سے کم شرط ایک نئے دماغ کی تیاری ہے جو یقیناً پرانی کتابوں کے مطالعہ سے تیار نہیں ہوسکتا۔ یہ نیا دماغ تشریح وتعبیر کے گھسے پٹے طریقوں کے بجائے قرآن مجید کو ایک نشانِ ہدایت کے طور پر کچھ اس طرح برتنے کا اہل ہوگا کہ انفرادی اور اجتماعی زندگی کی شاہراہ وحی کی تجلّیوں سے جگمگا اٹھے۔ آیات احکام کے ساتھ ساتھ آیات اکتشاف بھی اس کی توجہ کا محور ہوگا، گویا پوری کتابِ ہدایت کو ایک وحدت رسالہ کے طور پر برتنے کی طرح ڈالی جائے گی اور اس طرح **جعلوا القرآن عضین** کی موجودہ صورت حال کا خاتمہ ہو سکے گا۔ ہمیں اولاً اس حقیقت کا ادراک کرنا ہوگا کہ آخری نبی کے متبعین کی حیثیت سے اب رہتی دنیا تک تاریخ کی کمان ہمارے ہاتھوں میں تھما دی گئی ہے۔ رسولؐ کے غیاب میں قرآن مجید کی حیثیت ایک ایسے **حجة بعد الرسل** کی ہے جسے تمام اقوام عالم کے لیے منشورِ حیات کی حیثیت حاصل ہو۔ انسانی زندگی سے اس کی بے دخلی خواہ فکری ونظری التباسات کے سبب ہو یا تعبیر وتشریح، تاریخ وآثار اور کلامی وفقہی حیلوں سے اس کے مطالب پر پہرہ بٹھانے کی کوشش کی گئی ہو، ایسا کرنا صرف مسلمانوں کا ملّی نقصان نہیں بلکہ کاروانِ انسانی کی راہ گم کر دینے کا موجب ہے۔ گزشتہ چند صدیوں سے، جب سے عالمی سیادت سے ہماری معطلی عمل میں آئی ہے، اس کے بھیانک نتائج مسلسل سامنے آرہے ہیں۔ ثانیاً ہمیں اس حقیقت کے اعتراف میں بھی کوئی تکلف نہ ہونا چاہئے کہ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں دانش یونانی کے زیر اثر جس اجنبی کلامی منہج کی گونج سنائی دیتی تھی وہ بالآخر واصل کے اصول اربعہ سے جلا پا کر ایک مستند منہج علمی کے طور پر رائج ہوگئی۔ کلامی طریقۂ جرح وتعدیل سے نکلنے کی ہر کوشش مزید اسی عمل کا توسیعہ بنتی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فقہ وتعبیر کے کسی آزاد منہج کی تشکیل کے امکانات معدوم ہوتے چلے گئے۔ آنے والے دنوں میں مسلمانوں کے مختلف سیاسی فرقوں نے اس منہج کو اپنے گروہی مقاصد کے لیے استعمال کیا سو جو لوگ فلسفہ کے مخالف تھے انھیں بھی اپنے مخالفین کے مقابلے کے لیے کلام میں استعداد بہم پہنچانے کی ضرورت محسوس ہوئی اور اس طرح دین کی تشریح وتعبیر ہمیشہ ہمیش کے لیے ایک اجنبی منہج کی تابع ہو کر رہ گئی۔ نئے دماغ کے لیے لازم ہوگا کہ وہ اس مروّجہ منہج علمی کی مضرت رسانیوں سے نہ صرف یہ کہ آگاہ ہو بلکہ وہ کتاب وحکمت کی روشنی میں ایک نئے منہج علمی کے

قیام کا حوصلہ بھی رکھتا ہو۔ ثالثاً دانش یونانی نے رسالۂ محمدی کی مزاحمت میں منہج تعبیر وتفقہ کے علاوہ اکتشافی تحریک کا راستہ بھی روکنے کی کوشش کی تھی۔ یونانی علماء کی اکتشافی کتابوں کے ترجموں اور ان کی تقلیب و اصلاح میں عہد اموی اور عہد عباسی پر مشتمل چند قیمتی صدیاں ضائع ہوگئیں۔ اکتشافی علوم کے یونانی التباسات کو تو مسلمانوں نے مشاہدے اور تجربے کی میزان پر مسترد کر دیا اور اس کی جگہ علوم کی ایک نئی دنیا آباد کر ڈالی، البتہ فقہ وتعبیر کے کلامی منہج سے انھیں آج تک رہائی نہ مل سکی۔ نئے دماغ کے لیے صدیوں کی تعبیری روایت کا محاکمہ یقیناً کچھ آسان نہیں، لیکن اس کے بغیر ہر نئی ابتدا دراصل قدیم فرسودہ عمل کا توسیعہ ہو کر رہ جائے گی۔ رابعاً نئے دماغ کے لیے لازم ہوگا کہ وہ کتاب ہدایت سے اکتساب کے عمل میں تاریخ وآثار سے کام تو ضرور لے البتہ اسے فہم متن کی کلید نہ قرار دے ڈالے۔ وحی کا یہ مقام نہیں کہ اسے تاریخ وآثار کا تابع بنا دیا جائے۔ ایک حتمی وثیقہ کو جس کے لفظ لفظ کی صحت شکوک وشبہات سے بالاتر ہو، ظنی مآخذ کے حوالے کر دینا دراصل اس کی معطلی کے مترادف ہے۔ تاریخ کو نہ تو متن کی کلید قرار دیا جا سکتا ہے اور نہ ہی تاریخ کا یہ مقام ہے کہ وہ دین اور عقیدے کا سا اعتبار حاصل کر لے، جیسا کہ شیعہ، سنی، حنفی، شافعی اور زیدی، جعفری فرقوں کو دین کا مستند قالب قرار دینے کا سبب ہوا ہے۔ نیا مسلم دماغ جسے فی زمانہ کارِ رسالت کو پھر سے مہمیز کرنا ہے نہ تو شیعہ ہو سکتا ہے اور نہ ہی سنی اور نہ ہی حنفی، شافعی جیسے غیر قرآنی حوالوں سے اسے متہم کیا جانا چاہیے۔ خامساً ایک نئی ابتدا کی ضرورت اس اعتراف حقیقت کا حامل ہے کہ قرآن مجید کی برپا کردہ علمی اور اکتشافی تحریک کے مطلوبہ نتائج برپا ہونا ابھی باقی ہیں۔ اجنبی منہج علمی کی سرایت اور اس کے نتیجہ میں آگے چل کر اکتشافی کے بجائے اساطیری طرز فکر کی مقبولیت نے بالآخر ہماری پیش قدمی پر روک لگا دی۔ تسخیر و اکتشاف کے داعیوں نے خود اپنے ہی ہاتھوں ۱۵۸۰ء میں استنبول میں قائم کردہ دنیا کی سب سے بڑی رصدگاہ کو منہدم کر ڈالا۔ یہ وہی عہد ہے جب ٹائیکو براہے مغرب میں یورپ کی پہلی رصدگاہ کے قیام کے لیے جدوجہد کر رہے تھے۔ آگے چل کر، کوئی پون صدی بعد، ۱۶۷۵ء میں انگلینڈ میں واقع گرین وِچ کی پہاڑی پر برطانوی رصدگاہ کے قیام نے سیادت کی تبدیلی کا گویا اعلان کر ڈالا۔ گرین وچ مین ٹائم بہت جلد ساری دنیا کے لیے معیارِ وقت بن گیا۔ نئے مسلم ذہن کو اساطیری طرزِ فکر کو خیر باد کہتے ہوئے ایک بار پھر وقت اور تاریخ کی کمان کو اپنے ہاتھوں میں لینا ہوگا اور یہ تب ہی ممکن ہے جب اسے اس بات کا واقعی ادراک ہو کہ وہ کوئی اور نہیں بلکہ امت مامور ہیں جن کے بغیر تاریخ کا سفر بے معنی ہو جاتا ہے۔

نئے دماغ کی تیاری اور متحدہ مسلم شخصیت کی تعمیر کے لیے ایک ایسی دانش گاہ کا قیام بڑے انقلابی نتائج کا حامل ہو سکتا ہے جہاں سب کچھ از سر نو کر دکھانے کا عزم پایا جاتا ہو۔ ایک ایسی تقلیبِ فکری جو ماضی کو عبرت کے لیے پڑھتی، حال کو تحلیل وتجزیہ کی میزان پر پرکھتی اور مستقبل کو بصیرت کی روشنی میں دیکھنے کی اہل ہو۔ فی زمانہ دنیا بھر میں دانش گاہوں کے جو نمونے ہمارے سامنے ہیں اور جن کے دم سے موجودہ تہذیب کی چمک دمک قائم ہے خواہ یہ شرق میں واقع ہوں یا غرب میں پائے جاتے ہوں ان سے اخذ واکتساب میں ہمیں کمال درجہ کی احتیاط برتنی ہوگی۔ مشرق میں اگر علم ثنویت کا

شکار ہے تو مغرب میں بھی خاص طور پر ملٹری انڈسٹریل کمپلیکس کے قیام کے بعد ادب وفلسفہ وسائنس وٹیکنالوجی کے مابین خلیج مسلسل وسیع ہوتی رہی ہے۔ فلسفہ اور ادب کا طالب علم مغرب کے ٹکنالوجیکل تہذیب میں اجنبی اور تنہا ہو کر رہ گیا ہے۔ گویا علمی ثنویت اور شخصیت کی دولختی سے مغرب کی دانش گاہیں بھی محفوظ نہیں بلکہ سچ تو یہ ہے کہ سوپر اسپیشلائزیشن نے روحِ جستجو کو کچھ اس طرح حصے بخرے کر دیا ہے کہ ایک عمومی ناآگہی ہمارا مقدر بن گئی ہے۔ ایسی صورت میں مغرب کی اعلیٰ دانش گاہوں کو جوں کا توں درآمد کر لینا ہمارے مسائل کا مداوا نہیں ہوسکتا۔ دانش گاہیں محض علم نہیں بانٹتیں اور نہ ہی کسی مجرد علم کا کوئی وجود ہے بلکہ یہ ایک تہذیبی شخصیت کی تعمیر کرتی ہیں جو دراصل اس تصورِ حیات کی رہین منت ہوتی ہیں جن کی تاریخی، مذہبی اور تہذیبی روایت نے انھیں تشکیل دیا ہوتا ہے۔ یہ مغالطہ کم گمراہ کن نہیں کہ مغرب کی اعلیٰ دانش گاہوں کو عالم اسلام میں منتقل کر لینے یا ان کے کیمپس کے قیام سے ہم چشم زدن میں اپنے علمی افلاس کا سدباب کر سکیں گے۔ مغرب کی دانش گاہیں اپنی تمام تر جلالت علمی اور اعلیٰ تحقیقی معیار کے باوجود دراصل اہل مغرب کے تصورِ حیات کی پروردہ اور امین ہیں۔ ان سے مطلوبہ مسلم دماغ تو کجا ایک بے لوث آفاقی طرزِ فکر کی تعمیر کا امکان بھی کم ہے۔ خود مغرب کے ژرف بیں علماء ان دانش گاہوں کے زوال اور بے رحم سرمایہ کاروں کے ہاتھوں اس کی پامالی کا تذکرہ کرتے رہے ہیں۔ اس صورت حال کے واقعی ادراک کے لیے لازم ہے کہ ان امراض کی خاص طور پر نشان دہی کر دی جائے جن میں عہد جدید کی اعلیٰ ترین دانش گاہیں مبتلا ہیں اور جن سے اجتناب کی ہمیں ہر ممکن تدبیر کرنی ہوگی۔

اس میں شبہ نہیں کہ مغرب میں یونیورسٹیوں کے قیام اور اس کے ارتقا کی تاریخ اسلامی مشرق کے اثرات واحسانات سے مملو ہے۔ نئی تاریخ نویسی نے گزشتہ چند برسوں میں اس بات کے وافر ثبوت فراہم کر دیے ہیں کہ پالرمو، بلوگنا، پیرس اور آکسفورڈ کی یونیورسٹی عرب اسلامی اثرات کے نتیجے میں قائم ہوئی اور کوئی پانچ چھ صدیوں تک علوم عربیہ یعنی اکتشافی علوم کے لاطینی اور مقامی ترجمے ان دانش گاہوں میں داخل نصاب رہے، حتیٰ کہ ۱۶۱۹ء تک آکسفورڈ میں جیومیٹری اور فلکیات کے اساتذہ کے لیے عربی زبان سے واقفیت لازم خیال کی جاتی تھی۔ ابن سینا کے القانون فی الطب کا مغرب کی درس گاہوں میں متداول ہونا ہر خاص وعام کے علم میں ہے۔ ہم اس بات سے بھی ناآگاہ نہیں کہ فی نفسہٖ لفظ کالج کلیہ ہی کی مغرّب شدہ شکل ہے اور یہ کہ یونیورسٹیوں میں نہ صرف یہ کہ بیچلر، ماجستر اور ڈاکٹریٹ کی درجہ بندی اسلامی مشرق سے مستعار کردہ ہے بلکہ تقسیم اسناد کے موقع پر ہڈ اور گاؤن کا لباس فاخرہ آج بھی اس روایت کے اسلامی الاصل ہونے کی شہادت دیتا ہے۔ اس اعتبار سے مغرب کی دانش گاہیں ہمارے اکتشافی مشن کا ہی توسیعہ ہیں۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ ہم اپنی ہی پیدا کردہ اس عظیم الشان علمی روایت کے سلسلے میں اپنے دلوں میں تنگی محسوس کریں۔ اگر انیسویں صدی میں یورپ میں دانش گاہوں کی تقلیب فکری نہ ہوئی ہوتی اور اگر بعض سیاسی عوامل کے تحت انھوں نے اوہام اور پروپیگنڈے کو علم وآگہی کے منصب پر فائز نہ کیا ہوتا اور آگے چل کر خاص طور سے امریکی ملٹری انڈسٹریل کمپلیکس کے وجود میں آجانے کے بعد

سرمایہ داروں نے اسے اپنے مذموم مقاصد کی آماجگاہ نہ بنایا ہوتا تو ہمیں اس علمی روایت کو اپنی ترقی یافتہ شکل میں درآمد کرنے میں کچھ تکلف نہ ہوتا، لیکن افسوس کہ انیسویں صدی میں مغرب کے استعمارانہ ذہن نے نہ صرف یہ کہ اپنے تفوق کے جواز کے لیے نئے اساطیر تراشے اور انھیں مستند تاریخ کا درجہ دے ڈالا بلکہ ایسے علوم بھی ایجاد کیے جن کا بنیادی مقصد سفید فام نسل کے نسلی، سیاسی، تاریخی اور ذہنی تفوق پر دلیل لانا تھا۔ تاریخ ہو یا جغرافیہ نویسی، عمرانی علوم ہوں یا سائنٹفک ریس ازم سے مملو نام نہاد معروضی مشاہدات، انیسویں صدی میں مغرب کے دانشوروں نے اپنے تعصّبات اور اوہام سے علم کی ہر شاخ کو پامال کر ڈالا۔ استعمار کی صدیوں میں جہاں اسلامی مشرق اپنی بقا کی جنگ میں مصروف تھا، ان غیر علمی نظریات کو چیلنج کون کرتا؟ نتیجہ یہ ہوا کہ مغرب اپنے ہی پیدا کردہ تعصّبات کا قیدی بن کر رہ گیا اور اگلوں کے لیے مغربی علوم اور ان کی اتباع میں قائم ہونے والی دانش گاہیں دانشورانہ قید گاہیں بن گئیں۔ مثال کے طور پر فرائڈ کے سائکوانالسس کو لیجیے جس کا سکہ بیسویں صدی کے آخری ایام تک چلتا رہا ہے تا آنکہ نیوروسائنس کی جدید تحقیق اور برین میپنگ کے نئے آلات نے انسانی دل و دماغ کے سلسلے میں ایک بالکل ہی مختلف صورت حال کی خبر دی اور جس کے مطابق متصوفین کی کبریائی سے لے کر ڈپریشن کے مریضوں تک احساسات کی تبدیلی دراصل سیروٹونین میں سطح کی تبدیلی کے سبب بتائی جاتی ہے۔ ڈارون کا نظریۂ ارتقاء جس نے بیسویں صدی میں ایک طرح کی سائنٹولوجی کو جنم دیا، آج DNA کی جدید تحقیقات کے سبب اپنا اعتبار کھوتا جا رہا ہے۔ اسی طرح انتھروپالوجی کی وہ تمام قیاس آرائیاں جو اہل مشرق کو غیر عقلی اور وجدانی قرار دیتی ہیں اور اس کے برعکس مغربی انسان کو ایک عقلی رویہ کا حامل بتاتی ہیں یا جو یہ بتاتی ہیں کہ سفید فام انسان کا دماغ دوسری اقوام سے نسبتاً بڑا ہوتا ہے، اب اپنا اعتبار کھوتے جا رہے ہیں۔ لیکن ان جیسے دوسرے بہت سے گمراہ کن التباسات کی قلعی کھلنا ابھی باقی ہے۔ مارکس اور ویبر جیسے دو باہم مختلف تجزیہ نگار، جن کی فکری مداخلتوں نے مغربی ذہن کو مرصع کرنے میں اہم رول انجام دیا ہے، مشرق کے سلسلے میں ان کی گمراہ کن تاریخی بصیرت سے پردہ اٹھنا بھی ابھی باقی ہے۔ جب صورت حال یہ ہو کہ مغرب کے زیر اثر دنیا بھر کے اسکولوں میں رائج مرکیٹیئر کا تیار کردہ خریطۂ عالم غیر حقیقی صورت حال کا عکاس ہونے کے سبب مشرق کی تحقیر اور مغرب کی کبریائی کا کام انجام دے رہا ہو، جہاں محض پروپیگنڈے کے زور پر جزائر یورپ کا مختصر سلسلہ براعظم قرار پایا ہوا ور ہندو پاک جیسی وسیع سرزمین کو مشترکہ طور پر sub-continent کا رتبہ مل سکا ہو، جہاں گرین لینڈ کا مختصر خطہ جو رقبہ میں چین کا ایک چوتھائی ہونے کے باوجود چین کے مقابلہ میں دوگنا دکھائی دیتا ہو، جہاں اسکینڈے نیویا ہندوستان کے مقابلہ میں رقبہ میں ایک تہائی ہونے کے باوجود اس کے ہم پلہ دکھائی دیتا ہو اور اس مغرب زدہ گمراہ کن خریطۂ عالم کے اصلاح کی علمی کوشش یہ کہہ کر رد کر دی گئی ہو کہ اصل اسکیل پر نقشوں کی ترتیب نو ذوق لطیف کے خلاف ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یہ دنیا کا نقشہ نہ ہو بلکہ کسی نے بدہیئت، گیلے انڈرویئر لٹکا دیے ہوں، تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مغرب کی یہ جدید دانش گاہیں آزادانہ غور و فکر اور بے لاگ معروضی تجزیہ میں کتنی مدد و معاون ہو سکتی ہیں۔

یہ تو صرف ایک پہلو ہے اس دانشورانہ عقوبت گاہ کا جسے عرف عام میں آج یونیورسٹی کا نام دیا جاتا ہے ورنہ اصل صورت حال کہیں سنگین تر ہے۔ علم و تحقیق کی آزادانہ روایت کیسے قائم ہو جبکہ دل و دماغ پر تراشیدہ اوہام و اساطیر کے پہرے سخت ہوں۔ اب اگر ان دانش گاہوں کا نوحہ گاہے بہ گاہے خود ان ہی اداروں کے اندر سے سنائی دیتا ہے تو دراصل یہ وہ چند سعید، باغی اور بیدار مغز نفوس ہیں جنھوں نے مشکل ترین حالات میں بھی غور و فکر اور تنقید و محاکمہ کا کام جاری رکھا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ مغرب کی اعلیٰ دانش گاہیں عالم نزع میں مبتلا ہیں۔ اب ان کی حیثیت ان منارۂ نور کی نہیں جن سے انسانیت رہنمائی حاصل کرے بلکہ تجارتی اداروں کی سروس انڈسٹری کی ہو کر رہ گئی ہے۔ یہ اب صرف ڈزنی، ان ٹیل، مائیکروسوفٹ اور ان جیسی دوسری کمپنیوں کے لیے ان کی فرمائش اور ضرورت کے مطابق افرادی قوت پیدا کرنے میں مصروف ہیں۔ بلکہ تحقیق و اکتشاف کا عمل بھی متمول سرمایہ کاروں کی خواہشات کا تابع ہو کر رہ گیا ہے۔ ایسا اس لیے کہ تجارتی اداروں کی ایماء اور ان کی کفالت پر یونیورسٹیوں میں تحقیقی منصوبوں کی تعداد مسلسل بڑھتی جارہی ہے جس نے یونیورسٹی کے غایت و اہداف کو بڑی حد تک بے رحم سرمایہ داروں کی آرزوؤں کا تابع مہمل کر دیا ہے۔

اب جو لوگ یونیورسٹی کو اس کے اصل فریضۂ منصبی کے ساتھ پھر سے متصور کرنا چاہتے ہیں اور جو یہ چاہتے ہیں کہ اسے انیسویں صدی کے مغربی اوہام و تصورات سے نجات دلائیں، آزادانہ اور منصفانہ غور و فکر کی ریت پھر سے قائم ہو، ان کے لیے لازم ہوگا کہ وہ گزشتہ دو ڈھائی سو برسوں میں وجود میں آنے والے علوم کا کمالِ احتیاط اور عرق ریزی سے محاکمہ کریں۔ یہی وہ عہد ہے جب ہم سیادت کے منصب سے غائب رہے۔ مغرب جو صدیوں سے ہمارا متبع اور حریف چلا آتا تھا اس نے ہماری سیاسی مغلوبی سے فائدہ اٹھا کر تاریخ کو از سر نو لکھنے کی کوشش کی۔ اس نے اپنے تئیں بڑی ہوشیاری سے ہمیں اس تاریخ سے محروم کر دیا جو ہمیں ہماری اصل حیثیت پر مطلع کرتی اور آخری رسول کی امت کی حیثیت سے ہمارے تاریخی کلیدی رول کے سبب ہمیں ایک ناقابل شکست اعتماد سے معمور رکھتی۔ استعمارانہ عزائم کے جواز اور سفید فام اقوام کی عالم گیر لوٹ کھسوٹ کو اعتبار بخشنے کے لیے علوم کی صنعتیں کام پر لگا دی گئیں۔ اس عمل پر کوئی دو ڈھائی صدیاں گزرنے کے بعد آج مغرب اپنی ہی تعمیر کردہ دانشورانہ عقوبت گاہ میں محصور ہے۔ اس صورتِ حال کو بدل ڈالنے کے لیے اب تک گاہے بہ گاہے جو صدائے احتجاج سنائی دیتی رہی ہے، وہ بڑی مضمحل ہے۔ اب یہ ہم اہل مشرق کا فریضۂ منصبی ہے کہ علمی روایت کے تاریخی اور فطری امین ہونے کے سبب اور اس سبب کہ رہتی دنیا تک اقوامِ عالم کی رشد و ہدایت کا کام ہم سے لیا جانا ہے، ہم تاریخ کے اس نازک اور فیصلہ کن لمحے میں اس علمی روایت کی تطہیر کا کام اپنے ہاتھوں میں لیں۔

یاد رکھیے! جس فکری پیراڈائم نے مسائل کو جنم دیا ہو اس پیراڈائم میں یہ قوت نہیں ہوتی کہ وہ ان مسائل کا ازالہ بھی کر سکے۔ استعمارانہ عزائم اور بے رحم سرمایہ داری نے علوم اور ٹیکنالوجی کو اپنے مذموم مقاصد کے لیے استعمال کیا تا آنکہ غور

وفکر کے مغربی سانچے پامال اور پراگندہ ہو گئے۔ ساری دنیا پر سرمایہ داری کا مذموم شکنجہ سخت ہوتا گیا۔ ٹیکس کے جبری نظام میں فرد کی آزادی سلب ہو کر رہ گئی۔ ماحولیات کی تباہی اور اشیائے خورد و نوش کی حریصانہ تقلیب و تمسیخ کے سبب فرحت بخش غذا کا حصول مشکل ہو گیا۔ اب اس مسخ شدہ علمی ادارے سے یہ توقع کرنا کہ وہ ان مسائل کے حل میں ہماری مدد کر سکیں گے، پرلے درجہ کی سادہ لوحی ہوگی۔ ان کے پیش کردہ حل مزید مسائل کو جنم دیں گے۔ ہر حل دراصل ایک نئی مشکل کا آغاز ہوگا۔ ایسا اس لیے کہ یہ دانش گاہیں پرانے پیراڈائم سے باہر آ کر سوچنے کی صلاحیت سے محروم ہیں۔ دینی اداروں یا مدرسہ کو مجہلہ قرار دینے کا فیشن تو عام ہے لیکن جدید دانش گاہوں کی بند دماغی اور ان کے برپا کردہ ماحولیاتی فساد، معاشی بحران اور سیاسی جبر کی طرف ہماری نگاہیں کم ہی اٹھتی ہیں۔ مدرسوں پر اگر تقلید یونان اور تقلید آباء کا ماحول طاری ہے تو مشرق کی جدید یونیورسٹیاں بھی مغرب سے آنے والی ہر آواز کو بمنزلہ وحی سمجھنے کی غلطی میں مبتلا ہیں۔ اوّل الذکر جدید دنیا سے بے تعلق اور عضو معطل ہو کر رہ گئے ہیں تو ثانی الذکر کی چہل پہل کارپوریٹ کی فدویانہ خدمات کے دم سے قائم ہے۔ ایک نئی صبح کے قیام کے لیے لازم ہے کہ ہم قدیم و جدید سے ماوراء اور شرق و غرب کے تعصّبات سے دامن بچاتے ہوئے ایک ایسی دانش گاہ کا ڈول ڈالیں جو مروّجہ فکری پیراڈائم کے استرداد پر قائم ہوئی ہو اور جہاں ایک نئی شروعات کے لیے سیاسی، نفسیاتی، جغرافیائی، نسلی اور قومی مزاحم انتہائی کم پائے جاتے ہوں۔

ذرا غور کیجئے! عالمی سیادت سے مسلمانوں کے مؤثر انخلاء پر ابھی دو ڈھائی صدیاں گزری ہیں اور علامتی عثمانی خلافت کے غیاب پر ایک صدی بھی مکمل نہیں ہوئی ہے لیکن اس مختصر عرصہ میں انسانوں پر کون سی افتاد ہے جو نہ گزری ہو۔ جب سے اقوام یورپ کو سیادت کے مرکزی اسٹیج پر مؤثر رول ادا کرنے کا موقع ملا ہے چہار دانگ عالم میں ظلم و استبداد کے سایے مسلسل گہرے ہوتے رہے ہیں۔ مثال کے طور پر کولمبس جس کے بحری سفر کا رومانوی تذکرہ ہم بڑے شوق سے سنتے آئے ہیں، اس کی حقیقت اس کے علاوہ اور کچھ نہ تھی کہ صلیبی طالع آزماؤں نے وسائل کے حصول میں صرف پچاس سالوں کے اندر نئی دنیا امریکہ کی اسّی ملین کی مقامی آبادی میں سے ستر ملین کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ کہا جاتا ہے کہ سولہویں صدی میں میکسیکو کی آبادی پچیس ملین نفوس پر مشتمل تھی جو اس صدی کے اختتام تک صرف ایک ملین ہو کر رہ گئی۔ ان نوآبادیات میں جبراً مزدوری کے لیے سیاہ فام افریقی باشندوں کو غلام بنایا گیا۔ دنیا کے مختلف حصوں میں سفید فام یوروپی اقوام نے تہذیب کی اشاعت کے نام پر عمومی لوٹ کھسوٹ کا وہ بازار گرم کیا اور اتنے بڑے پیمانے پر تہذیب و معاشرت کو تلف کیا کہ منظم نسل کشی کی ایسی تصویر انسانی تاریخ میں اس سے پہلے نہیں ملتی۔ مصیبت یہ ہوئی کہ مہذب دنیا کا کوئی قابل ذکر خطہ اس جارحیت سے محفوظ نہ رہ سکا۔ اب تک انسانی تہذیب نے فرحت بخش زندگی جینے اور بقائے باہم کے جن امکانات کی تشکیل و تزئین کی تھی اور جس کے سبب جاوا، سماترا سے لے کر مراکش کے ساحلوں تک بحر اوسط کے دونوں طرف اور خود جزیرہ ہائے یورپ میں تہذیب کا جو مشترکہ قالب تشکیل پایا تھا، استعمارانہ کاسہ لیسیوں نے وہ سب کچھ

تباہ کر ڈالا۔ لہلہاتے کھیتوں اور سرسبز و شاداب علاقوں کے حصول کے لیے انسانوں نے اپنے ہی جیسے انسانوں کا کچھ اس منظم طریقے سے شکار کیا کہ بعض نسلیں صفحۂ ہستی سے معدوم ہوگئیں۔ اتنے بڑے پیمانے پر تہذیب کی تاراجی کے خلاف بجا طور پر توقع کی جاتی تھی کہ مغرب کے باضمیر انسانوں کی طرف سے اس صورت حال پر ایک عمومی بغاوت کی کیفیت جنم لے گی، مگر مصیبت یہ تھی کہ جن لوگوں نے جنگ و غارت گری کو مسلسل تجارت کی شکل دے رکھی تھی انھوں نے کمالِ عیاری کے ساتھ علمی اور تحقیقی اداروں کی موثر تقلیبِ فکری کر ڈالی تھی۔ اور جیسا کہ ہم پہلے ہی اشارہ کر چکے ہیں مغرب کی جامعات کا بنیادی فریضہ اب اس رزمیہ کی تشکیل اور اس کی تقدیس کا نغمہ گانا تھا جس کے مطابق اقوام مغرب سیادتِ عالم کے فطری سزاوار بتائے گئے تھے۔ مغرب میں یونیورسٹی کی یہ تقلیبِ فکری نہ صرف یہ کہ اس منارۂ نور کی تباہی کا سبب ہوئی جو نازک بحرانی لمحات میں اقوامِ مغرب کی گمرہی کا مداوا کر سکتی تھی بلکہ مسلمانوں کے عالمی افق سے غیاب کے سبب پوری دنیا پر ایک نئے عہد ظلمت کے طلوع کا سبب بھی بن گئی۔

نئی ابتدا کے لیے لازم ہے کہ ہم اس نکتہ سے پوری طرح آگاہ ہوں کہ یونیورسٹی کا فریضہ محض تعلیم و تعلّم یا تحقیق و اکتشاف نہیں بلکہ اس تصور حیات کو زندہ و تابندہ رکھنا بھی ہے جس میں تمام اقوامِ عالم کی یکساں فلاح و بہبود کے امکانات پائے جاتے ہوں۔ یونیورسٹی کی حیثیت ایک ایسے نشان راہ کی ہے جو ہمیں اس بات پر مسلسل مطلع کرتی رہتی ہے کہ آگے تاریخ کا سفر کن سمتوں میں طے پانا ہے۔ قرآنی دائرۂ فکر کی حامل یونیورسٹیاں ضروری نہیں کہ صرف مسلم معاشروں میں پائی جائیں۔ بالکل اسی طرح جیسے کہ آج یہ ممکن ہوسکا ہے کہ مغربی اور سرمایہ دارانہ تصور حیات کی حامل جامعات مسلم معاشروں میں متحرک رہیں اور ان کی نظری اجنبیت کا کسی کو احساس بھی نہ ہو۔ عہد وسطیٰ کے یورپ میں جہاں تعلیم و تعلّم کا نظم اور کتاب کائنات پر غور و فکر کی قرآنی روایت نے یورپ کی یونیورسٹیوں کے قیام اور استحکام میں کلیدی رول انجام دیا تھا وہاں کسی کے حاشیۂ خیال میں بھی یہ بات نہیں آتی تھی کہ تحقیق و اکتشاف کی یہ روایت دراصل مسلمانوں کی علمی ثقافت کا توسیعہ ہے اور یہ کہ اس کی جڑیں وحی ربانی کے صفحات میں پائی جاتی ہیں۔ آج بھی جو لوگ ایک نئی یونیورسٹی کا ڈول ڈالیں گے انھیں اس بات کا خاص طور پر التزام کرنا ہوگا کہ یونیورسٹی کی بنیاد اس تصور حیات پر رکھی گئی ہو جس سے قرآن کی دعوتِ تسخیر و اکتشاف عبارت ہے۔ ایک آفاقی، الہامی اور زندگی بخش تصورِ حیات کے بغیر قائم کی جانے والی ہر دانش گاہ خواہ وہ اپنے مظاہر میں کتنی ہی خیرہ کن کیوں نہ ہو اور وسائل کی بہتات نے اس پر زندگی کا کتنا ہی دبیز ملمع کیوں نہ چڑھا دیا ہو ان کی اصل حیثیت روح سے خالی نالج انڈسٹری سے زیادہ نہیں ہوسکتی۔ شرق اوسط کی بیشتر دانش گاہیں جو اس معصوم اور موہوم توقع کے ساتھ قائم کی گئی ہیں کہ شاید اس طرح چشم زدن میں علوم کی کھیتی لہلہا اٹھے اور ایک بار پھر عالم اسلام اپنے سابقہ علمی تفوق کے عہد میں واپس آجائے، اگر روزِ اوّل سے ایک طرح کی بے نشاطی میں مبتلا ہیں تو اس کی وجہ یہی ہے کہ یہاں یونیورسٹی کے تمام لوازم کے ساتھ مغربی ذہن اور مغربی تصور حیات بھی دانستہ یا نادانستہ طور پر درآمد کر لیے گئے ہیں۔ کہیں

شوقِ سیادت اور کہیں جوشِ اصلاح میں یہ نکتہ یکسر نظر انداز ہو گیا ہے کہ ہر شخص بنیادی طور پر ایک تاریخی اور ثقافتی شخصیت بھی ہوتا ہے۔ تصورِ حیات کی تبدیلی کے ساتھ ہمارے خواب بھی بدل جاتے ہیں۔ ایک مہذب شخص کی فطرت ثانیہ اس تہذیب سے تشکیل پاتی ہے جس کا وہ پروردہ ہوتا ہے، گویا فرد کے خواب کا یونیورسٹی سے رشتہ بہت گہرا ہے اور اس بات میں کچھ حرج بھی نہیں کہ بے رحم امریکی ثقافت اور جابر سرمایہ دارانہ نظام کے پروردہ امریکی دانشور کا خواب مسلمان عالم سے یقیناً مختلف ہونا چاہئے۔ ہمیں یہ بات بھی سمجھنی ہوگی کہ علمی روایت خریدی نہیں جاتی اور نہ ہی کرایے کے مشیر کسی قوم کو سیادت جیسے منصب عظیم کے لیے تیار کر سکتے ہیں، بلکہ اندیشہ ہے مبادا مغرب کی دانش گاہوں کو جوں کا توں برآمد کر لینا خود ہمارے خواب کی تبدیلی کا سبب نہ بن جائے۔

دائرۂ فکر اگر محفوظ و مامون ہو اور اہدافِ زندگی اگر واضح ہوں تو تحقیق و اکتشاف کی نئی دنیا آباد ہونے میں دیر نہیں لگتی۔ ماضی میں ہماری دانش گاہوں نے تمام التباسِ فکر و نظر کے باوجود اگر تہذیب انسانی کے سفر کو آگے بڑھانے میں مؤثر رول ادا کیا ہے تو اس کا سبب یہی تھا کہ ہم اپنے نظری اور دینی فریضۂ منصبی کی رفعتوں سے بخوبی آگاہ تھے۔ آج بھی اگر ہمارے خواب ہمیں واپس مل جائیں تو ہماری دانش گاہیں شوقِ جستجو کی نئی آماجگاہ بن سکتی ہیں، پھر ہمیں مروّجہ نظامِ تعلیم کو جوں کا توں برآمد کرنے، علوم کو خانوں میں تقسیم کرنے اور طالب علموں کے دماغوں کو مغربی اقدار اور ان کی ہیبت علمی سے مملو کرنے کی ضرورت پیش نہ آئے گی۔ ہمیں اس حقیقت کا ادراک جتنا جلد ہو جائے بہتر ہے کہ یونیورسٹی کا موجودہ نظام جہاں علوم کی زمرہ بندی اور تقسیم یک رخے علما کو جنم دینے کا باعث بنی ہے وہیں داخلے اور امتحانات کے مروجہ میکانیکی نظام میں غیر معمولی اور عبقری صلاحیتوں کے نمو پانے کا امکان معدوم ہو کر رہ گیا ہے۔ یہ سارا نظام ایک طرح کی mediocrity کے لیے تشکیل دیا گیا ہے جو فارغین کو سرمایہ دارانہ نظام کے میکانیکی کل پرزوں سے کچھ زیادہ تسلیم نہیں کرتا۔ پھر یہاں ایسے لوگوں کے لیے گنجائش کیسے نکل سکتی ہے جو اس تعلیمی نظام کی خامیوں کے اعلان کے ساتھ ہی اس کی بساط لپیٹنے کا عملی اقدام بھی کر سکیں۔ نئی مجوزہ دانش گاہ کے لیے لازم ہے کہ وہ ایک ایسا تعلیمی نظام وضع کرے جہاں عبقری دماغ اور شوقِ جستجو سے معمور و مضطرب طلباء اپنے غایت و اہداف کے حصول کا وافر امکان پائیں۔

دائرۂ فکر کی حفاظت کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ نئی یونیورسٹی کسی مولویانہ معتقدات کی حامل ہو، جیسا کہ مسالک کی دانش گاہیں اپنے اساتذہ اور طلباء سے خاص مسلکی فکر کے فروغ و استحکام کی توقع کرتی ہیں یا جیسا کہ کیتھولک یونیورسٹی کے مؤسسین ایک طرح کی moralizing کو فریضۂ منصبی جانتے ہیں۔ بلکہ اس سے مراد ایک ایسے صحت مند ماحول کی تشکیل ہے جہاں طالب علم خود اپنی زندگی کے غایت و اہداف کو طے کرنے کے لیے آزاد ہو۔ خدا کی کائنات میں امین کائنات کی حیثیت سے وہ اپنے لیے کس رول کو پسند کرتا ہے یہ طے کرنا خود اس کا کام ہے بلکہ اسے اس بات کی بھی اجازت ہونی چاہئے کہ وہ قرآنی تحریک اکتشاف کے غایت و اہداف کی از سر نو تعبیر کر سکے۔ گویا تعبیرات کے محاکمہ کا کام مسلسل ایک عمل

ہو۔ یہی طریقہ ہے دائرۂ فکر کی حفاظت کا اور زندگی کو نئی رفعتوں سے مسلسل آراستہ کیے رکھنے کا۔

علم جب تک میکانیکی درس گاہوں کی دست و برد سے محفوظ تھا، مسجد سے رصد گاہ تک اور کتاب سے فقہاء و محدثین اور قصاص کی مجلسوں تک ایک ہی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو مرصع کرنے کا عمل جاری رہتا۔ طبیب اور ادیب، فقہاء و سائنس داں، قسمت آشنا اور فلک شناس سبھوں پر قرآن مجید کے بنیادی مطالب اور معاشرے کے غایت و اہداف واضح ہوتے۔ آیاتِ کائنات جملہ علوم کی روشنی میں مطالعہ کی میز پر ہوتی۔ تب علم کا حصول ایک طرح کی طمانیت قلبی عطا کرتی۔ **انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء** کی یہ عمومی فضا علوم کی وحدت کی پیدا کردہ تھی۔ یہ کہنا کہ وہ عبقری شخصیات کا زمانہ تھا جب یونان سے لے کر سولہویں صدی تک کے عالم اسلام میں ایک ہی شخص طبیب بھی ہوتا تھا اور فلسفی بھی، فقیہ بھی ہوتا تھا اور کیمیا گر بھی، موقیت بھی ہوتا تھا اور ماہر فلکیات بھی، دراصل عہد حاضر کے انسانوں کی تحقیرِ بے دلیل ہے۔ کانٹ کی اصطلاحِ مستعار میں اسے 'self-imposed immaturity' میں مبتلا کرنا ہے اور شاید یہ سب کچھ اس لیے کہ وہ اپنی اصل حیثیت اور امکانی صلاحیت سے ناواقف سرمایہ دارانہ نظام کے کل پرزے کی حیثیت سے کام پر لگا رہے۔ نئی مجوزہ یونیورسٹی کو موجودہ یونیورسٹیوں میں پائی جانے والی ناآگہی کی اس فضا کو ختم کرنے کے لیے مؤثر منصوبہ بندی کرنی ہوگی، جبھی یہ ممکن ہے کہ ہماری دانش گاہوں سے ذہنی نابالغوں کی فوج ظفر موج نکلنے کے بجائے ایسے عبقریوں کی نسل نکل سکے جو فکر و فن کی دولت سے آراستہ ہوں، جو قائدانہ اعتماد سے سرشار دنیا کو بدل ڈالنے کا حوصلہ رکھتے ہوں۔ پیشہ ورانہ کورسز کے فارغین جو ناآگہی اور ذہنی نابالغی کے سبب زندگی کے اعلیٰ غایت و اہداف کا ادراک نہیں رکھتے اور جو حقیر منفعت کے عوض اپنی زندگیوں کو بین الملکی کمپنیوں کے ہاتھوں بیچنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں، ان کے مقابلے میں وہ لوگ جو اس مکروہ نظام کی مکاریوں سے واقف ہوں اور جنھیں اپنی زندگی کی اصل قیمت اور بے پناہ امکانات کا احساس ہو وہ یقیناً اس صورت حال کو ٹھنڈے پیٹوں نہیں برداشت کر سکتے۔ نئی دانش گاہ کو ایسے علماء تیار کرنے ہوں گے جو صحیح معنوں میں polymath یعنی شیخ الکل ہوں۔ ایک ایسا نصاب تعلیم وضع کرنا ہوگا جو طلباء کو زوال پذیر سرمایہ دارانہ نظام کا آلہ کار بنانے کے بجائے انھیں نئی تبدیلیوں کے لیے مرصع (empower) کر سکے۔

مجوزہ یونیورسٹی کو مستقبل شناس اور زندگی آشنا ہونا چاہیے۔ اس کی حیثیت ایک منارۂ نور یا قبلہ نما کی تو ضرور ہو، لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس کے فارغین اخلاقی وعظ و نصائح تک خود کو محدود رکھیں یا آگہی کا زعم انھیں بسم اللہ کے گنبد میں محصور کر دے۔ ہم کوئی عالمِ خیال قائم کرنے نہیں اٹھے ہیں اور نہ ہی ہمارا کام کسی غیر عملی utopia کی تشکیل ہے۔ ہم تو اس دائرۂ فکر کی از سرِ نو تشکیل کے لیے کوشاں ہیں جس نے نزول قرآن کے بعد ایک علمی اکتشافی تحریک کو جنم دیا تھا اور جس کے سبب متبعین محمدؐ کے ہاتھوں میں تاریخ کی لگام تھما دی گئی تھی۔ قرآنی دائرۂ فکر میں ایک نئی یونیورسٹی کا قیام عہد وسطیٰ کے ماحول کو پھر سے متصور کرنا ہرگز نہیں بلکہ نئی بدلی ہوئی صورت حال میں اقوامِ عالم کو نشاط انگیز زندگی سے آشنا کرنا ہے اور یہ

تب ہی ممکن ہے کہ جب مجوزہ یونیورسٹی اپنے اطلاقی اور عملی ہونے کا احساس دلا سکے۔ مثال کے طور پر کھانا، کپڑا اور مکان کی بنیادی ضرورتوں کو لیجئے۔ فرحت بخش غذا جسے اب organic food کا نام دیا گیا ہے اور جو اب عام انسانوں کی دسترس سے باہر ہے، اس کی عمومی دستیابی کے امکان کو تحقیق و تجزیہ کا موضوع بنانا ہوگا۔ اب تک قدیم، فرسودہ، زوال زدہ سرمایہ دارانہ تہذیب کے انجینئر بلند بالا عمارتوں اور فلک بوس ٹاوروں کی تعمیر کو اپنے فن کی معراج سمجھتے رہے ہیں۔ انھیں اس بات کا چنداں اندازہ نہیں کہ آنے والے دنوں میں جب توانائی کی فراہمی مشکل ہوتی جائے گی اور جب توانائی کا کثرتِ استعمال ماحولیات کی تباہی پر منتج ہوگا اور بالآخر ہم توانائی کے بے مہابا استعمال سے خود کو روکنے پر مجبور پائیں گے، اس وقت یہ متروک فلک بوس عمارتیں آثار قدیمہ کا منظر پیش کریں گی۔ جو لوگ آج بھی اسی طرز تعمیر کے تعلیم و تعلّم میں مصروف ہیں وہ یقیناً ایک فرسودہ طرز فکر کے نقیب ہیں۔ اس کے برعکس مستقبل آشنا منصوبہ سازوں کی تمام تر توجہ اس امر پر ہونی چاہئے کہ توانائی کے کم سے کم استعمال اور ماحولیات کی آلودگی کے بغیر ایسے رہائشی منصوبے کیسے تشکیل دیے جائیں جو فطرت سے اپنی ہم آہنگی کے سبب جنت ارضی کا سماں پیش کرتے ہوں۔ مستقبل کی نشاط انگیز زندگی کا یہ نقشہ اس وقت تک ترتیب نہیں دیا جا سکتا جب تک کہ ماحولیات، انجینئرنگ، علم الارض، آرکیٹیکچر، الیکٹرانکس، ایگریکلچر اور عمرانیات کے علماء یا مخزن العلم (Polymath) شخصیتیں اس منصوبے میں مشترکہ حصہ نہ لیں۔ ازمنۂ قدیم سے ہم فطری توانائی کے مختلف ذرائع استعمال کرتے آئے ہیں۔ ونڈمل، واٹرمل ماحولیاتی ہم آہنگی کے باوجود ہماری ضرورتوں کی کفالت نہیں کر سکتے۔ اٹامک انرجی کے بعد اب فیوجن انرجی کے حصول کی جدوجہد جاری ہے۔ یہ بات طے ہے کہ مستقبل میں جو توانائی کے ماخذ کو کنٹرول کرنے کی پوزیشن میں ہوگا اسے یہ اختیار بھی حاصل ہوگا کہ وہ اقوامِ عالم کی ترجیحات کو متعین کر سکے۔ مجوزہ یونیورسٹی کو اس قسم کے علمی چیلنج کو قبول کرنا ہوگا تاکہ وہ جدید دنیا میں ہونے والی مختلف تحقیقات کے مالہ و ماعلیہ کا قرار واقعی جائزہ لے کر قائدانہ اقدامات کر سکے۔ ہم کسی متبادل military-industrial-complex کے قیام کے لیے نہیں اٹھے ہیں لیکن ہم اس نکتہ سے ناآگاہ بھی نہیں کہ تاریخ کے ہر دور میں جن لوگوں نے اقوامِ عالم کی قیادت کی ہے ان پر اس آیت قرآنی **وانزلنا الحدید فیھا بأس شدید** کا مفہوم خوب واضح تھا۔ ہم جب تک بی-۵۲ بمبار طیاروں، ڈرون حملوں اور ان جیسی دوسری حربی ٹیکنالوجی کے مؤثر دفاع کا سامان نہیں کرتے یا ان کے متبادل اور مقابل اسلحوں کی ایجاد پر قادر نہیں ہوتے، سیاسی محکومی اور ذہنی غلامی ہمارا مقدر رہے گی۔ کرایے کے دانشور اور تنخواہ دار علمی مشیر ہمیں زیادہ سے زیادہ جا لینے (catch-up) کی نفسیات میں مبتلا رکھ سکتے ہیں۔ یہاں معاملہ ان تک پہنچنے کا نہیں بلکہ ان پر سبقت لے جانے کا ہے۔ اس عمل میں وہ ہرگز ہمارے معاون نہیں ہو سکتے، اس کے لیے تو ہمیں از خود اقدامات کرنا ہوں گے۔